جواباتِ نصاریٰ

مصنفہ

شیخ الاسلام ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ
جون سنہ ۱۸۶۸ء مارچ سنہ ۱۹۴۸ء

تقسیم بلا قیمت

ندوۃ المحدثین گوجرانوالہ پاکستان

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ

وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔

*

جواباتِ نصاریٰ

عیسائیوں کے رسالہ "حقائق قرآن" کا جواب "معارفِ قرآن"

"اثبات التثلیث" مصنفہ پادری عبدالحق صاحب کا جواب "اثبات التوحید"

"میں مسیحی کیوں ہوا؟" مصنفہ پادری سلطان محمد پال صاحب کا جواب "تم عیسائی کیوں ہوئے؟"

از افاداتِ

شیخ الاسلام مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری رح

ندوۃ المحدثین گوجرانوالہ (پاکستان)

دیباچہ

پہلے مجھے دیکھئے

عرصہ ہوا عیسائیوں نے ایک ٹریکٹ شائع کیا تھا، جس کا نام تھا "حقائق قرآن" اس کا جواب اخبار اہلحدیث مورخہ ۱۰ صفر ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۹۱۸ء میں دیا گیا تھا بعد ازاں اطراف و اکناف میں جہاں جہاں عیسائی حقائق کو بانٹتے، جواب کی مانگ آتی، اخباری مضمون سب جگہ نہیں پہنچتا۔ اس لیے اس کو کتاب کی صورت میں کیا گیا۔

پھر عیسائیوں کی طرف سے ایک کتاب "اثبات التثلیث فی التوحید" شائع ہوئی۔ اس کا جواب بھی اہلحدیث مورخہ ۲۹ جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۵ جنوری ۱۹۲۶ء میں دینا شروع کیا، جو متعدد پرچوں میں چلتا ہوا ختم ہوا اس کی اشاعت کی بھی ضرورت ہوئی تو اس کو بھی اس کتاب میں درج کیا گیا۔

ایک صاحب سلطان محمد خاں نے اپنے عیسائی ہونے کی وجوہات میں ایک رسالہ شائع کیا تھا۔ جس کا نام تھا "میں مسیحی کیوں ہوا؟" ۳ ستمبر ۱۹۲۸ء کو مباحثہ حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ (پنجاب) میں مصنف نے بڑے زور سے جواب کا تقاضا کیا، چنانچہ اس کا جواب بھی اہلحدیث مورخہ ۱۹ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں شائع ہونا شروع ہوا، جو کئی نمبروں میں ختم ہوا۔ حسبِ ضرورت اس مضمون کو بھی اسی کتاب میں درج کیا گیا ہے۔

ناظرین سے درخواست ہے کہ ان مضامین کو خود دیکھیں گے۔ اور اپنے احباب کو بھی دیکھنے کی ترغیب دیں گے۔

مؤلف، ستمبر ۱۹۳۰ء۔

اَلدَّالُ عَلَی الْخَیْرِ کَفَاعِلِہٖ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی نَبِیِّہٖ وَاٰلِہِ الْکَرِیْمِ

معارف قرآن

بجواب

حقائقِ قرآن

عیسائیوں کی طرف سے ایک ٹریکٹ شائع ہوا ہے جس کا نام حقائق قرآن ہے۔ اس میں مصنّف نے دعویٰ کیا ہے کہ از روئے قرآن ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السّلام حضرت سیدالانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل وبرتر ہیں۔ اس دعوے پر مصنف مذکور نے قرآنی حوالہ جات سے کام لیا ہے اور نمبر شماری کی حیثیت سے چودہ تک نوبت پہنچائی ہے۔ رسالہ مذکور کو تو ہم نے معمولی سمجھا تھا مگر بعض احباب نے بڑے زور سے اس کے جواب کی فرمائش کی ہے۔ اس لئے آج اس کا جواب دیا جاتا ہے۔

لائق مصنّف سے ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے فضیلت اور افضلیت کا کوئی معیار قائم نہیں کیا، اس لئے ان کو معمولی معمولی باتوں میں دھوکہ لگا ہے۔ یا انھوں نے خود دھوکہ دیا ہے۔

فضیلت کا معیار خدمات ہے اور خدمات بھی وہ جن میں مشکلات زیادہ ہوں۔ ایک جرنیل شاہی خاندان سے ہے جس کے نام کے ساتھ بہت سے شاہی لقب لگے

ہوئے ہیں - مگر جنگ کے موقع پر اس کی خدمات کا یہ حال ہے کہ وہ کسی حد تک کامیاب نہیں ہوا بلکہ ناکامی ہی میں محصور ہو کر یا تو گرفتار ہو گیا یا دشمنوں کے نرغے سے نکل گیا -

دوسرا[2] جرنیل وہ ہے جو دشمنوں پر غالب آتا ہے مگر دشمن بھی بڑی قوت اور شوکت والے نہ تھے - اس کی خدمت گو اتنی نہیں لیکن پہلے کی نسبت بہت کچھ ہے -

تیسرا جرنیل وہ ہے جو باشوکت خطرناک دشمن کے مقابلہ میں کامیاب ہوا، گو زخمی بھی ہوا مگر آخر کار کامیاب ہوا، تو جو عزت اور فضیلت قوم میں، حکومت میں، دنیا کے اہل دانش اور باانصاف اصحاب کی نظر میں اس جرنیل کو حاصل ہو گی وہ پہلے دونوں کو نہیں ہو گی - گو بعض بعض امور میں حکومت کی طرف سے اُن کی رعایت کی جائے گی لیکن اصل عزت اور فضیلت میں آخری جرنیل ہی اعلیٰ اور افضل ہو گا -

یہ تمہید بالکل صحیح ہے - جیسا کہ کوئی باانصاف دانا اس کا مخالف یا منکر نہ ہو گا بس رسالہ مذکور کا جواب اس تمہید سے یوں ہے کہ حضرت مسیحؑ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمات الٰہیہ کا مقابلہ کر کے فیصلہ کر لو کہ دنیا میں اپنی مفوضہ خدمات میں کامیاب کون ہوا، اور ناکام کون ؟

یاد نہ ہو تو سنیئے ! حضرت مسیحؑ دنیا سے گئے تو صرف بارہ[12] یا سولہ[16] آدمی آپ کے فیض سے مستفیض تھے - جن میں سے بھی بعض کمزور اور ضعیف الخیال اور دشمنوں کا چاروں طرف سے نرغہ تھا - بر خلاف اس کے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت دنیا سے رخصت ہوئے کہ ارد گرد کوئی ایک متنفس بھی آپ کے مقصود اور خدمات کا مخالف نہ تھا - بلکہ حسب پیشگوئی یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ط تمام مخالفین جو جان کے بھوکے اور خون کے پیاسے اور دین الٰہی کے دشمن تھے - بدل و جان آپ کے تابع فرمان اور زیر نگین قرآن ہو چکے تھے - کیا سچ ہے ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی ۔۔۔ عرب کی زمین جس نے ساری ہلا دی
نئی لگن اک سب کے دل میں لگا دی ۔۔۔ اک آواز سے سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غُل یہ پیغام حق سے ۔۔۔ کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نام حق سے

بس اس مقابلہ خدمات سے یہ امر بالوضاحت ثابت ہے کہ (حسبِ شہادت اناجیل مروجہ) حضرت مسیحؑ کی خدمات بمقابلہ خدماتِ محمدؐ یہ ایسی ہیں کہ ان کو ناتمام یا نامکمل کہنا بھی ان کی عزت افزائی ہے ۔

مفصّل جواب

اس حصّے میں پادری صاحب کے نمبروں کا ایک ایک کر کے جواب دینا ہو گا ۔ پس غور سے سنیئے :

س نمبر ۱ : مسیح کی پیدائش بے باپ معجزانہ تھی ۔ لہٰذا وہ آنحضرتؐ سے افضل تھے ۔

ج نمبر ۱ : بے باپ پیدا ہونے سے فضیلت ثابت نہیں ہوتی ۔ اگر بے باپ ہونا فضیلت ہے تو بے باپ اور بے ماں ہونا تو اور بھی فضیلت ہوئی حالانکہ عیسائی حضرت آدمؑ کو بھی حضرت مسیحؑ سے افضل نہیں جانتے ۔

ہاں بے باپ ہونے سے کچھ ثابت ہوتا ہے تو خدا کی قدرت کاملہ کا اظہار ہوتا ہے ۔ چنانچہ قرآن مجید خود اس کی وجہ بتاتا ہے ۔ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ط (ہم مسیح کو بے باپ پیدا کر کے اپنی قدرت کی ایک نشانی بتائیں گے) اس سے مسیحؑ کی فضیلت کا کیا ثبوت ؟

س نمبر ۲ : مسیح کی والدہ مریم کو سب جہان والوں پر فضیلت تھی ۔ لہٰذا مسیحؑ افضل ہے ۔

ج نمبر ۲ : یہ وجہ بھی غلط ہے ۔ والدہ کی فضیلت اور چیز ہے ، مولود کی اور ۔ فضیلت کے مسئلہ میں اسلام کا وہی اصول ہے جو شیخ سعدی مرحوم نے بتایا ہے ؎

ہُنر بنما اگر داری نہ جوہر ۔۔۔ گل از خار است ابراہیمؑ از آذر

س نمبر ۳ : مسیح کی پیدائش کے وقت خارق عادت امور ظاہر ہوئے ۔ درخت خرما خشک سے تر ہو گیا ۔ چشمہ جاری ہو گیا وغیرہ ۔

ج نمبر ۳ - اس سے بھی کچھ ثابت ہوا، تو قدرتِ خداوندی کا اظہار ہوا نہ کہ مسیح کی فضیلت - ایسی مثالیں بہت ملتی ہیں کہ ایک یتیم بچے کی پرورش کا انتظام خدا ایسا کر دیتا ہے کہ بادشاہ زادوں کا نہیں ہوتا - مثال کے لئے نورجہان بیگم زوجہ جہانگیر بادشاہ کے واقعات ملاحظہ ہوں -

س نمبر ۴ - مسیحؑ نے شیر خوارگی میں کلام کیا - لڑکپن میں ان کو کتاب ملی لہذا وہ افضل -

ج نمبر ۴ - حیرانی ہے پادری صاحب ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کی مثال کیوں صادق کر رہے ہیں - خداوند تعالیٰ نے ان کو شیر خوارگی میں بلوا کر اپنی قدرت کاملہ کا اظہار کیا حضرت عیسیٰ کو لڑکپن میں کتاب دی تو حضرت یحییٰ کو لڑکپن میں نبوت عطا کی - وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (ہم نے یحییٰ کو لڑکپن میں نبوت دی) غور سے پڑھو - اس سے فضیلت کہاں ثابت ہوئی فضیلت خاص کر افضلیت تو ذاتی افعال سے ہوتی ہے جو آپ نے دکھائے نہیں -

س نمبر ۵ - از روئے قرآن ثابت ہے کہ مسیحؑ کو جب دشمنوں نے پکڑنا چاہا تو آسمان سے فرشتے آ کر اُسے بجسم خاکی آسمان پر لے گئے اور کفار سے بچا لیا - اور حضرت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مخالفوں نے محاصرہ کیا تو کوئی فرشتہ نہ آیا - نہ ان کو آسمان پہ اٹھایا - لہذا مسیح افضل -

ج نمبر ۵ - چونکہ پادری صاحب نے فضیلت یا افضلیت کا کوئی معیار قائم نہیں کیا، اس لئے آپ اس طرح کی کمزور دلیلیں پیش کر کے اپنا دل خوش کر رہے ہیں - سنئے یہ واقعہ حضرت مسیحؑ کی افضلیت پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ آنحضرتؐ کی افضلیت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ اپنی ذاتی دلاوری اور قرب الٰہی میں یہاں تک بڑھے ہوئے تھے کہ نہ کسی فرشتے کی آپ کو حاجت تھی نہ بغرضِ حفاظت آسمان پر جانے کی - کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا - وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (اللہ آپ کی حفاظت کرے گا) چنانچہ اللہ ہی نے آپ کو محفوظ رکھا - اصل بھید اس میں یہ تھا کہ حضرت مسیح کی زندگی دنیا میں فقط غریبی کی رہی - مگر ہمارے حضورؐ کی زندگی

کے دو حصے مقدّر تھے۔ ایک غریبی کا، دوسرا سرداری کا۔ ہجرت کی رات تک (جس کی طرف پادری صاحب نے اشارہ کیا ہے) حضورؐ کی زندگی کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ ادھر حضرت عیسیٰ کی زندگی کا پہلا دور یعنی غریبی حصہ آسمان پر جانے تک ختم ہوگیا۔ مگر ہمارے حضورؐ کی زندگی کا سرداری حصہ ہجرت کے بعد سے شروع ہو کر اپنے کمال کو پہنچا۔ اسی حصے میں آپؐ نے اپنے مذہب اور دین الٰہی کی وہ خدمات انجام دیں جو جناب مسیحؑ سے نہ ہوسکیں۔ انہی خدمات کی وجہ سے آپ کو سب نبیوں سے بڑھ کر کامیابی ہوئی۔ اور انہی خدمات کی وجہ سے آپ کو سب سے افضل کہا جاتا ہے تو بجا ہے۔ آسمان پر چلے جاتے تو یہ خدمات کون کرتا۔ غار میں چھپنا اور وہاں سے محفوظ نکلنا بھی آپ کی فضیلت کی دلیل ہے۔ اگر مدینہ میں پہنچکر کامیابی کے بعد برسر حکومت اور بااقبال زندگی پر فائز نہ ہوتے۔ تو انجیل کی پیشینگوئی کے مصداق نہ ہوتے جو جناب مسیح نے آپؐ کی بابت فرمائی تھی کہ میرے بعد دنیا کا سردار آنا ہے۔" (مفصل آگے دیکھو)

س نمبر ۶ - مسیح کا جسم باوجود حاجت لبشریہ کے آج تک محفوظ ہے حالانکہ اور کسی کا نہیں۔ ثابت ہوا کہ مسیح افضل ہیں۔

ج نمبر ۶ - اس میں بھی وہی غلطی ہے جو پادری صاحب کو ہر بات میں پیش آتی ہے جسم مسیح کا محفوظ رہنا دلیل قدرت خداوندی کی ہے جو باوجود اسباب فنا کے کسی چیز کو فنا نہ ہونے دے۔ اس سے اس چیز کی افضلیت ثابت نہیں ہوتی۔

حضرت مسیح تو ایک نبی اور رسول ہیں۔ دنیا میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو محض جماد (بے جان) ہیں۔ مگر ان کی زندگی حضرت مسیح سے بلکہ جہان کی کل چیزوں سے بڑی ہے۔ مثلاً پہاڑ۔ چاند۔ سورج اور ستارے وغیرہ۔ تو کیا ان کو بھی حضرات انبیاء علیہم السلام پر فضیلت ہوگی۔ ہرگز نہیں۔ خوبی تو ذاتی خوبی اور خدمت گذاری سے حاصل ہوتی ہے۔

س نمبر ۸، ۹ - مسیح نے جانوروں کو پیدا کیا۔ حالانکہ پیدا کرنا خاصہ خداوندی ہے۔ اور بیماروں کو اچھا کیا۔ ثابت ہوا کہ مسیح افضل ہیں۔

ج نمبر ۸، ۹ - اس نمبر کو دھوکہ دہی یا دھوکہ خوری کہیں یا قرآن مجید سے ناواقفی کہیں سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں خلق اشیا (پیدا کرنا) خاصہ خداوندی بیشک ہے۔ اور اس خاصہ میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔ قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ ھُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَھَّارُ ط (اللہ اکیلا ہی سب چیزوں کا خالق ہے)

ہاں حضرت مسیحؑ کی بابت جو خلق کا لفظ آیا ہے وہ محض برائے نام ہے ورنہ اصل میں کچھ نہیں یعنی جو کچھ ہے وہ خدا کے حکم سے ہے مسیح کی ذات کو اس میں دخل نہیں۔ قرآن مجید میں الفاظ ہیں:

اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَھَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَ اُبۡرِیُٔ الۡاَکۡمَہَ وَ الۡاَبۡرَصَ وَ اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ (پ ۳- ع ۱۳)

مَیں مٹی سے جانور کی سی شکل بناتا ہوں پھر اس میں پھونکتا ہوں پس وہ اللہ کے حکم سے زندہ جانور بن جاتا ہے۔ اور مَیں بیماروں کو اچھا کرتا ہوں اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں یہ سب کام اللہ کے اذن سے کرتا ہوں۔

یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ حضرت مسیحؑ باختیار خود یہ کام نہ کرتے تھے بلکہ مسیح کا کام صرف وہی تھا جو انسانی طاقت میں ہے کہ کسی چیز میں پھونک دینا، یا بیمار کو دم کر دینا مگر اس پھونک میں اور اس دم میں اثر ڈالنا خدا کا کام تھا اس لئے نہ مسیح خالق ہے نہ خاصہ خدائی میں فرق آیا، بلکہ آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ آپکی خوش فہمی ہے خود غلطی ہے۔

س نمبر ۱۰ - قرآن میں ذکر ہے کہ لوگ جو کچھ گھروں میں کھاتے یا رکھتے تھے حضرت مسیحؑ ان کو بتا دیتے تھے۔ یہ علم غیب کی صفت ہے جس میں مسیح ... ہیں۔ ثابت ہوا کہ مسیحؑ افضل ہیں۔

ج نمبر ۱۰ - اس میں تو بہت ہی کمال کیا۔ قرآن مجید عام طور پر نبیوں کو خدا کی طرف سے اطلاع ملنے کا قائل ہے۔ ارشاد ہے: فَلَا یُظۡھِرُ عَلٰی غَیۡبِہٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ (خدا کسی کو غیب کی خبر نہیں کرتا مگر اپنے رسولوں کو)

چنانچہ ہمارے رسول علیہ السلام کو بھی کئی امور کی اطلاع ہوئی۔ اسی طرح ہر نبی کو وقتاً فوقتاً اطلاع علی الغیب ملتی رہی۔ حضرت مسیح کو بھی کسی امر پر اطلاع تو اس سے اُن کی افضلیت کہاں ثابت ہوئی۔

س نمبر ۱۱ - قرآن مجید میں تمام انبیاء کے گناہوں کا ذکر ہے۔ خصوصاً حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بابت حکم ہے۔ اِسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ، وَوَجَدَكَ ضَالًّا۔ مگر مسیح کی بابت گناہ کا کوئی ذکر نہیں۔ ثابت ہوا کہ مسیح افضل ہے۔

ج نمبر ۱۱ - خوش اعتقادی سے آدمی جو چاہے کہہ لے۔ ورنہ بات کی تہ کو پہنچنا مشکل ہے۔ قرآن مجید کسی نبی کو بھی گنہ گار نہیں بتاتا۔ بعض کے حق میں کسی فعل کا ذکر کرتا ہے جو گناہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ یا تو قبل نبوّت کے زمانہ کا ہوتا ہے یا اس کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔ آنحضرت کی بابت جو یہ ہے کہ اِسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ اس پر عیسائیوں کا بڑا زور ہے۔ حالانکہ یہ حکم عام مسلمانوں کو بصیغہ مفرد مخاطب ہے۔ یعنی ہر ایک مسلمان کو یوں حکم ہے کہ تم اپنے لئے اور دیگر مؤمنین کے لئے بخشش مانگا کرو۔ بظاہر اس میں خطاب آنحضرت کو ہے جس سے قرآن کی اصطلاح سے ناواقفوں کو دھوکہ لگتا ہے لیکن اگر وہ غور کریں تو اُن کو معلوم ہو جائے کہ یہ خطاب بعینہٖ ایسا ہے جیسا سردار قوم کے ذریعے قوم کو حکم دیا جاتا ہے۔ جیسا بائیبل میں ہے۔ "اے اسرائیل سُن (استثنا ۶/۳) قرآن مجید کے دوسرے مقامات کو بھی غور سے سُنیے۔ جہاں آنحضرت کا نام لے کر قوم کو حکم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ (اے نبی اللہ سے ڈرا کر، اور کسی کافر یا منافق کی بات مت سُنا کر) عام اُمّت کو حکم ہے۔ اور فرمایا: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ۔ "اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو عدّت میں دیا کرو۔" جس طرح ان آیات میں بصیغہ خطاب مسلمانوں کو حکم ہوتا ہے۔ اسی طرح اس آیت (اِسْتَغْفِرْ) میں بصیغہ مخاطب تمام مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنے لئے اور دیگر مسلمانوں کے لئے بخشش مانگا کرو۔ جسے تعلیم فرمائی:

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَلِاِخۡوَانِنَا الَّذِیۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِیۡمَانِ "اے خدا ہم کو اور
ہمارے گذشتہ بھائیوں کو بخشدے"

قرآن مجید تو بیشک حضرت مسیح کو بڑے پایہ کا نبی، بلکہ اولوالعزم رسول
مانتا ہے مگر انجیل سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہ اُن سے بھی ہوئے - ایک جگہ اپنی والدہ
مکرمہ کو "اے عورت" کہہ کر پکارا - پھر پانی کے مٹکوں کو شراب بنادیا وغیرہ - شاید اس
لئے جب اُن کے سامنے ان کو نیک کہا گیا تو انھوں نے نیک کہلانے سے
انکار کیا - چنانچہ لکھا ہے :

"ایک نے اسے کہا - اے نیک استاد، اس نے اس کو کہا تو کیوں مجھے
نیک کہتا ہے - نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا" (متی باب ۱۹ کی کتاب ۱۶)
اسی لئے ایوب نبی کی کتاب میں درج ہے : جو عورت سے پیدا ہوا کیا ہے
کہ صادق ٹھہرے - (ایوب ۱۵/۱۴)
پس مسیح بھی جو عورت سے پیدا ہوئے - بقول بائیبل کیونکر پاک اور بیگناہ
کہلا سکتے ہیں - (مفصل آگے)

س نمبر ۱۲، ۱۳ - حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عرصہ ہوا، فوت ہو گئے
اور حضرت مسیح ابھی تک آسمان پر زندہ ہیں - قرآن کہتا ہے، زندہ اور مُردہ برابر نہیں -
از رُوئے مسلّمات اسلام قریب قیامت مسیح بنی آدم کی رہبری کے لئے آوینگے - اول
آخر مسیح ہادی ٹھہرا - لہٰذا ثابت ہوا کہ مسیح افضل ہیں -

ج نمبر ۱۲، ۱۳ : یہ بھی ایک دھوکہ ہے جو پادری صاحب کو لگا ہی یا انھوں
نے دیا ہے - مُردہ اور زندہ کس چیز میں برابر نہیں ؟ ان کاموں میں جو ظاہری
زندگی سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ رُوحانی مراتب اور فضیلت میں - اگر ایسا ہو تو فرمائیے
بقول عیسائیاں حضرت مسیح مر کر تین روز قبر میں پڑے رہے - اسوقت انکے شاگرد جو
زندہ تھے اُن سے افضل تھے ؟ بلکہ جن لوگوں نے ان کو پھانسی دیا تھا - وہ بھی زندہ تھے
تو کیا وہ بھی مسیح سے افضل تھے ؟ اس کا جواب ہر ایک عیسائی نفی میں دیگا - پھر اس جسمانی

زندگی اور موت سے روحانی بہتری اور کہتری کا کیا ثبوت؟ محض غلط فہمی ہے۔

س نمبر ۱۳ - حضرت مسیح قیامت سے پہلے آکر دجال کو مارینگے۔ تمام اہل کتاب اس پر ایمان لاوینگے۔ معلوم ہوا کہ مسیح خاتم النبیین اور افضل ہیں۔

ج نمبر ۱۳ - ہم مانتے ہیں کہ قیامت کے قریب مسیح اگر یہ کام اور اس کے سوا اور کام بھی کریں گے۔ مگر بماتحتی حضرت محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) دین اسلام کی خدمت بجا لاویں گے اور اسی خدمت کے لئے اُن کو زندہ رکھا گیا ہے، تاکہ جو نقص خدمت اور بظاہر ناکامی ان کی پہلی زندگی میں ظہور پذیر ہوئے اس کی اچھی تلافی ہو جائے۔ اس سے مسیح کی افضلیت ثابت نہیں ہوتی بلکہ آنحضرت کی افسری اور افضلیت ثابت ہوتی ہے جن کے دین کی خدمت مسیح کے سپرد ہوگی۔

س نمبر ۱۴ - بحکم فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا مسیح کے اندر الٰہی ذات تھی۔ پس وہ صاحب الوہیت تھے۔ اس لئے ایک گنہ گار رسول سے افضل تھے۔

ج نمبر ۱۴ - پادری صاحب کا دعویٰ ہے کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے از روئے قرآن مجید لکھا ہے۔ اس نمبر میں جناب نے قرآن مجید کی صریح نصوص کا خلاف کیا ہے۔ غور سے سنیئے! قرآن شریف الوہیت مسیح کو صاف لفظوں میں ردّ کرتا ہے۔ حضرت مسیح کی نسبت عیسائیوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک تو کہتا ہے کہ مسیح ہی اللہ ہے جو بلباس انسانی دنیا میں آیا ہے۔ ہمارے لئے اس نے جسم اختیار کیا۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ باپ (اللہ) بیٹا (مسیح) اور روح القدس تینوں معبود ہیں۔ قرآن مجید نے ان دونوں کا رد کیا ہے۔ غور سے سنیئے!

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ (خدا سے منکر ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ ہی مسیح ہے) دوسرے گروہ کا ان لفظوں میں رد کیا ہے۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ (خدا سے منکر ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ تینوں معبودوں میں سے ایک اللہ ہے)

پھر اس دعویٰ کو صرف دعویٰ کی صورت میں نہیں چھوڑا۔ بلکہ عقلی و نقلی دلیلو

سے ۔۔ کیا۔ عقلی دلیل یہ دی ۔ کَانَا یَأْكُلَانِ الطَّعَامَ (یعنی مسیح اور اس کی والدہ کھانا کھاتے تھے) جو کھانے کا محتاج ہو وہ معبود کیسے ہو سکتا ہے۔

نقلی دلیل یہ دی ۔ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ (مسیح نے خود کہا تھا ۔ اے بنی اسرائیل اللہ پاک کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے) اِن دونوں دلیلوں کے علاوہ تیسری دلیل قرآن مجید نے یوں بیان کی ہے جو بہت ہی غور طلب ہے ۔ فرمایا:

إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ (یعنی مسیح خدا کا بندہ تھا ۔ جس پر خدا نے انعام کئے اور اس کو بنی اسرائیل کی طرف ہادی بنا کے بھیجا)

ان آیات اور ان کے سوا اور بہت سی آیات کے ہوتے ہوئے کسی عیسائی کا یہ دعوی کرنا کہ از روئے قرآن مجید مسیح میں الٰہی ذات ثابت ہوتی ہے کس قدر زورِ تعصب اور ضد ہے ۔

مختصر یہ کہ افضلیت کا اظہار خدمت دینی سے ہوتا ہے سلسلۂ انبیاء علیہم السلام پر نظر غائر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر مشکلات میں کامیابی ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوتی ہے وہ کسی نبی کو نہیں ہوئی ۔ بس آپ افضل تھے ۔

شاید ہمارے دعوے کے مقابلہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیش کیا جائیگا لیکن ان کے تاریخی حالات جاننے والوں سے مخفی نہ تھا کہ یہ مقابلہ صحیح نہیں ۔ کیونکہ حضرت موسیٰ کو وہ قوم ملی تھی جو پہلے سے نبوّت خصوصاً خاندانی نبوّت کی قائل تھی حضرت موسیٰ کی منکر نہ تھی بلکہ منتظر تھی ۔ فرعون اور فرعونی قوم مخالف تھی ۔ سو اخیر تک مخالف رہی ۔ حضرت موسیٰ بحکم الٰہی اپنی قوم کو لے کر ہجرت کر گئے لیکن جس ارادہ سے ان کو لے گئے کہ ملک شام کو فتح کر کے اپنی آبادی کرینگے ۔ قوم کی نافرمانی سے اُسمیں کامیاب نہ ہو سکے ۔ ۔۔ اسی جنگل میں جان بحق تسلیم ہوئے جو اُن کی منزل مقصود نہ تھا، بلکہ راستہ ۔۔ ۔ ادھر ۔۔ ہمارے حضور نے سخت ترین مشرکوں، ضدی کافروں اور اعلیٰ درجہ کے

معاندین پر نہ صرف اخلاقی اور مذہبی فتح پائی، بلکہ ظاہری حکومت بھی اعلیٰ شان کی کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ کامیابی اس کو کہتے ہیں۔ آہ!

دل کس ادا سے لیتے ہو بتلا دیا کہ یوں　　آہن کو مقناطیس پہ دکھلا دیا کہ یوں

چونکہ ہمارے حضورؐ پر نور کی خدمات دینی اور کامیابی بھی اعلیٰ درجہ کی ہے، اس لئے حضورؐ کے مدارج بھی سب نبیوں سے اعلیٰ اور سب سے افضل ہیں۔ کیا پادری صاحب اس مقابلہ میں ہمارے سامنے آسکتے ہیں؟

بس تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا　　یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

دنیا کا سردار

پادری صاحب نے تعصب کے نشہ میں اپنے مسلمات کی بھی پرواہ نہیں کی۔ قرآن مجید سے حضرت مسیح کی افضلیت ثابت کرنے لگے ہیں۔ جو مشکل کام ہے۔ حالانکہ انجیل سے اس کا فیصلہ آسان تھا۔ ہم اس فیصلے کو نقل کر کے پبلک سے انصاف چاہتے ہیں۔ جناب مسیح اپنی دنیاوی کے آخری حصے میں شاگردوں کو وعظ کہتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تم سُن چکے ہو کہ میں نے تم کو کہا کہ میں جاتا ہوں اور تم پاس پھر آتا ہوں۔ اگر تم مجھے پیار کرتے۔ تو تم میرے اس کہنے سے کہ میں باپ پاس جاتا ہوں۔ خوش ہوتے کیونکہ میرا باپ مجھ سے بڑا ہے اب میں نے تمھیں اس کے واقع ہونے سے بیشتر کہا تاکہ جب وہ وقوع میں آوے تو تم ایمان لاؤ۔ بعد اس کے میں تم سے بہت کلام نہ کروں گا" اس لئے کہ اس جہان کا سردار آتا ہے۔ اور مجھ میں اس کی کوئی چیز نہیں (یوحنا ۱۴ باب کی ۲۹ سے)"

جناب مسیح نے اس مقام پر جس بزرگ کو جہان کا سردار کہا ہے جس کو اسی انجیل کے چودھویں اور سولہویں باب میں روح حق اور تسلی دینے والا فرمایا ہے اور یہ وہی ہے جس کے کام یہ بتلاتے ہیں کہ وہ میری (مسیح کی) تعریف کریگا۔ میری نسبت دنیا کو عدالت اور راستی سے قصوروار ٹھہرائے گا۔ چنانچہ ہمارے حضورؐ پر نور نے یہ سارے کام کئے۔ جناب مسیح کی ایسی تعریف کی کہ خود پادری صاحب گواہ ہیں کہ انھوں نے

قرآنی حوالہ سے مسیح کو آنحضرت سے افضل سمجھ لیا۔ اور مسیحؑ کے منکروں (یہودیوں) کو قصوروار بھی ٹھہرایا؟

پس ثابت ہوا کہ بقول حضرت مسیح ہمارے حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے سردار ہیں۔ پھر ان کی افضلیت میں کیا شبہ؟

عیسائیوں پر احسانِ قرآن

اسلام اور قرآن بذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں آیا۔ تو جناب مسیح کے حق میں دو گروہ تھے۔ (۱) ایک معتقدین عیسائی جو اُن کو اُن کے اصل رُتبے سے بہت اُونچا دکھاتے تھے کہ بندے سے خدا بناتے۔ (۲) دوسرے یہودی جو جناب کی شان میں بہت بدگو تھے۔ سخت ہتک آمیز الفاظ سے یاد کرتے۔ خدا اور رسول تو کیا بھلا آدمی یا معمولی آدمی جاننا بھی اُن کے نزدیک جُرم تھا، اور ہے۔ ایسی حالت میں قرآن اور پیغمبر اسلام علیہ السلام نے دونوں گروہوں کی اصلاح یوں کی کہ الوہیت کے قائلین کو یوں سمجھایا کہ وہ خدا نہ تھے اور یہودیوں کو یوں سمجھایا کہ وہ نبی بلکہ اولوالعزم رسول تھے۔ اس سے مسلمانوں پر بھی جناب مسیح کی عزت کرنا ضروری ہو گیا۔

سوال یہ ہے

کہ اگر پیغمبر اسلام (معاذ اللہ) یہودیوں کے ہمزبان اور ہمخیال ہو جاتے تو آج جناب مسیحؑ کے بدگوؤں کی تعداد میں کتنے کروڑ کا اضافہ ہوا ہوتا۔

کیا پھر اس احسان یا محبت یا اظہارِ صداقت کا نتیجہ عیسائیوں کی طرف سے یہ ہونا چاہیئے جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان والاشان سے کر رہے ہیں۔

عیسائیو! ع

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھو!
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

اثباتُ التوحیدُ

بجواب

اثباتُ التثلیث

یعنی

پادری عبدالحق صاحب مشنری کے رسالہ اثبات التثلیث پر ایک نظر

عیسائیوں کا عقیدہ تثلیث بہت پرانا ہے۔ قرآن مجید کے نزول کے وقت بھی بہت سے عیسائی اس عقیدے کے قائل تھے اور آج بھی ہیں۔ اس عقیدے کی تصویر چونکہ مشکل ہے اس لئے مخالفوں کے قلم سے تو وہ کسی طرح صحیح نہیں اتر سکتی۔ لہذا عیسائیوں کے قلم کی کھینچی ہوئی ہم پیش ناظرین کرتے ہیں:۔

عیسائیوں میں عقیدہ "اتھاناسیس" مشہور ہے جو تثلیثی علماء کے نزدیک مدار نجات ہے۔ اس عقیدہ کی تعریف کے الفاظ مع اس کی تصویر کے درج ذیل ہیں:۔

جو کوئی نجات چاہتا ہو۔ اس کو سب باتوں سے پہلے ضرور ہے کہ عقیدہ جامعہ رکھے۔ اس عقیدے کو جو کوئی کامل اور بے داغ نگاہ نہ رکھے وہ بے شک عذاب ابدی میں پڑے گا۔

اور عقیدہ جامعہ یہ ہے کہ ہم تثلیث میں واحد خدا کی اور توحید میں تثلیث کی پرستش کریں۔ نہ اقانیم کو ملائیں نہ ماہیت کو تقسیم کریں کیونکہ باپ ایک اقنوم بیٹا ایک اور روح القدس ایک اقنوم ہے مگر باپ بیٹے اور

روح قدس کی الوہیت ایک ہی ہے - جلال برابر عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے -
باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح قدس غیر مخلوق -
باپ غیر محدود اور روح قدس غیر محدود -
باپ ازلی. بیٹا ازلی اور روح القدس ازلی، تاہم تین ازلی نہیں، بلکہ ایک ازلی -
اسی طرح تین غیر محدود نہیں - اور نہ تین غیر مخلوق، بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود - یوں ہی باپ قادر مطلق - بیٹا قادر مطلق اور روح قدس قادر مطلق تو بھی تین قادر مطلق نہیں - بلکہ ایک قادر مطلق ہے -
ویسا ہی باپ خدا، بیٹا خدا، اور روح القدس خدا، تسپر بھی تین خدا نہیں، بلکہ ایک خدا ؎
اسی طرح باپ خداوند، بیٹا خداوند اور روح القدس خداوند، تو بھی تین خداوند نہیں، بلکہ ایک خداوند - کیونکہ جس طرح مسیحی عقیدہ سے ہم پر فرض ہے کہ ہر ایک اقنوم کو جُدا گانہ خدا اور خداوند مانیں - اسی طرح دین جامع سے ہمیں یہ کہنا منع ہے کہ تین خدا یا تین خداوند ہیں - باپ کسی سے مصنوع نہیں - نہ مخلوق نہ مولود - بیٹا اکیلے باپ سے ہے - مصنوع نہیں نہ مخلوق پر مولود ہے - روح قدس باپ اور بیٹے سے ہے نہ مصنوع نہ مخلوق نہ مولود - پر نکلتا ہے - پس ایک باپ ہے - نہ تین باپ - ایک بیٹا ہے نہ تین بیٹے - ایک روح قدس ہے نہ تین روح قدس ؎
اور اس تثلیث میں ایک دوسرے سے پہلے یا پیچھے نہیں - ایک دوسرے سے بڑا یا چھوٹا نہیں، بلکہ بالکل تینوں اقانیم باہم ازل سے برابر یکساں ہیں ؎
اس لئے سب باتوں میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا تثلیث میں توحید کی

اور توحید میں تثلیث کی پرستش کرنی چاہیئے۔ پس جو کوئی نجات چاہتا ہے اسے ضرور ہے کہ تثلیث کی بابت ایسا ہی سمجھے علاوہ اس کے نجات ابدی کے لئے ضرور ہے کہ ہمارے خداوند یسوع مسیح کے مجسم ہونے پر بھی ایمان صحیح رکھے۔ کیونکہ ایمان صحیح یہ ہے کہ ہم اعتقاد اور اقرار کریں کہ خدا کا بیٹا ہمارا خداوند یسوع مسیح خدا اور انسان بھی ہے۔

خدا ہے باپ کی ماہیت سے عالموں کے پیشتر مولود اور انسان ہے اپنی ماں کی ماہیت سے عالم میں پیدا ہوا۔ کامل خدا اور کامل انسان نفس ناطقہ اور انسانی جسم کے ساتھ الوہیت کی راہ سے باپ کے برابر، اور انسانیت کی راہ سے باپ سے کمتر وہ اگرچہ خدا اور آدمی بھی ہے۔ پر دو نہیں بلکہ ایک مسیح ہے۔ ایک بھی اس طور نہیں کہ الوہیت کو جسم سے بدل ڈالا۔ بلکہ انسانیت کو خدا میں لیا۔ سب طرح سے ایک ہی ماہیت کے ملانے سے نہیں بلکہ اقنوم کی یکتائی سے۔ کیونکہ جس طرح نفس ناطقہ اور جسم ایک انسان ہے۔ اسی طرح خدا اور انسان ایک مسیح ہے جس نے ہماری نجات کے واسطے دکھ اٹھایا۔ عالم ارواح میں جا اُترا۔ تیسرے دن مردوں میں سے جی اُٹھا۔ (دعائے عمیم ص $\frac{25}{26}$)

اس عقیدے کے اثبات پر قلم اُٹھانے سے بڑے بڑے علماء مسیحیت گھبراتے رہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے ایک یورپین پادری (فنڈر) نے اس کے اثبات کا تہیّہ کیا تھا۔ اُس کے بعد ایک نوجوان مسلم زادہ نو عیسائی پادری عبدالحق پنجابی نے ایک رسالہ موسومہ "اثبات التثلیث فی التوحید" ان دنوں شائع کیا۔

پادری صاحب موصوف نے اس رسالہ میں معقولی اصطلاحات سے تثلیث جیسے محال عقیدے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ زبانی گفتگو میں ہم نے پادری صاحب کو ناز کرتے سُنا۔ نیز جواب کی تمنا ظاہر کی۔ اس لئے بادلِ ناخواستہ آج ہم اس پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

پادری صاحب نے معقولی اصطلاحات تو بہت لکھی ہیں مگر فنِ مناظرہ سے بالکل دُور ہو کر رسالہ ہٰذا تصنیف کیا ہے۔ ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ مدعی کا فرض ہے کہ سب سے پہلے اپنے دعوے کی تصویر بلکہ تشریح بتائے۔ بعد ازاں اس پر دلیل پیش کرے۔ پھر مخالف کے اعتراضات کو دفع کرنے پر متوجہ ہو۔ اس کے بعد منکر کا حق ہے کہ اس دلیل پر تین طرح میں سے کسی طرح اعتراض کرے۔ (نقض۔ منع، یا معارضہ) مگر پادری صاحب نے اپنے دعوے کی تشریح تو کجا، سادہ لفظوں میں بیان دعویٰ بھی نہیں کیا اور نہ اس پر باقاعدہ کوئی دلیل دی ہے۔ بلکہ بجائے اثباتِ تثلیث کے بخیالِ خویش ابطالِ توحید پر کمر باندھ لی ہے۔ پادری صاحب مصنف نے تو اپنا دعوٰے بیان نہ کیا۔ البتہ دیباچہ نویس نے ازراہِ مہربانی تثلیثی عقیدے پر کسی قدر مدھم سی روشنی ڈالی جس کے الفاظ یہ ہیں:

"واجب تعالیٰ واحد ہے اور اس کی ذات واحد میں اقانیم ثلاثہ اب ابنِ روح القدس ہیں۔ جن کی ماہیت ایک اور قدرت و جلال میں برابر ہیں" ص

بس اس دعوے کا بارِ ثبوت پادری عبدالحق کے ذمہ ہے جس سے افسوس کہ وہ سبکدوش نہیں ہوئے۔ اور نہ ہو سکتے ہیں۔

بہر حال جو کچھ اُن سے ہو سکا۔ اس کا پہلا نمبر یہ ہے آپ لکھتے ہیں:

"اگر ہر طرح کی کثرت کا مفہوم حادث مانا جائے تو لازم آتا ہے کہ ہر طرح کی وحدت کا مفہوم بھی حادث ہو۔ بیان ملازمت یہ ہے کہ وحدت بمقابلہ کثرت کے ہوتی ہے نہ کہ علیحدہ کوئی موجودِ خارجی۔ کیونکہ کثرت بہ تکرار وحدت اور وحدت بتجزیہ کثرت حاصل ہوتی ہے اور وحدت عام ہی اور کثیر خاص۔ کیونکہ کثیر مجموعہ احاد کا نام ہی یعنی کثیر واحد سے زائد کو کہتے ہیں اور زائد کو زیادتی بعد انتہا کم کے نکلا کرتی ہی پس واحد سے زیادہ کا نام کثیر ہی اور کثیر سے کم کا نام واحد ہے جیسے کہ بیشی کے بغیر کمی کا مفہوم کچھ نہیں ویسے ہی بغیر کثرت کے وحدت کوئی شئی نہیں۔ وحدت و کثرت اور فوقیت۔ تحتیت ایسی صفات نہیں جو کہ

خارج میں قائم بہ موصوف ہوں - بلکہ یہ مفہومات نسبت یکدگر اور امور اعتباریہ سے متعلق ہیں اور فوقیت بغیر تحتیت اور تحتیت بغیر فوقیت، اور اسی طرح کثرت بلا وحدت اور وحدت بلا کثرت کوئی مفہوم ہی نہیں - پس اگر ذات واجب تعالیٰ ہر طرح کی کثرت کے مفہوم سے خالی مانی جائے تو بغیر نسبت و تقابل اس سے کسی طرح کی وحدت کیسے منسوب ہو سکتی ہے۔" (ص۴)

جواب کس قدر فاش غلطی اور اصل نزاع سے دوری ہے - اہل اسلام عقیدۂ تثلیث سے اس کے مفہوم کی وجہ سے منکر نہیں - نہ انکو اسکے اصل مفہوم سے کوئی مطلب ہے، بلکہ اس کے مصداق کے وجود سے منکر ہیں - سنیئے! عبدالحق کا مفہوم کیسا پیارا اور اہل اسلام کا پسندیدہ ہے مگر عبدالحق کا مصداق مصنف رسالہ ہذا اہل اسلام کا کسی طرح محبوب اور مقبول نہیں کیونکہ وہ توحید کے بجائے تثلیث کا قائل ہے۔

ایسا ہی یہ بھی مغالطہ ہے جو آپ کہہ رہے ہیں کہ بغیر کثرت کے وحدت کوئی شئ نہیں کیونکہ یہ بھی مفہوم وحدت اور مفہوم کثرت کی نسبت گفتگو ہے نہ کہ مصداق کی نسبت، کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی وحدت کا مفہوم ممکن الکثرت ہو مگر اسکے مصداق میں کسی قسم کی کثرت نہ ہو - اعتبار نہ ہو تو سورج کو دیکھیے کہ لفظ "سورج" کا مفہوم کلی ممکن الکثرت ہے - مگر مصداق اس کا ہمیشہ سے واحد غیر متکثر ناقابل الکثرت ہے پس آئندہ مفہوم اور مصداق میں فرق سمجھا کریں - اہل اسلام مفہوم وحدت اور مفہوم کثرت پر حکم وجوب یا امتناع نہیں لگاتے بلکہ اُن کے مصادیق پر لگاتے ہیں -

آپ نے اسی دعوے پر دوسری دلیل یہ لکھی ہے:-

"اگر واجب تعالیٰ کے لئے وحدت عددی مانی جائے تو اول تو وہ بے حد و بے عد نہ رہا - دوم چونکہ واحد عدد کا بعض ہے نہ کہ کمال - کیونکہ عدد واحد منجملہ دیگر اعداد کے ہے اسلئے ذات واجب تعالیٰ کیلئے تبعیض لازم آئے گی - نیز عدد کلی متکرر النوع ہے ازیں ہم کہ مثلاً عدد عشرہ عشر وحدات یا احاد سے مرکب ہے اور ان وحدات میں کی ہر وحدت کی وحدت معروض

بوحدت ہے کیونکہ ہر وحدت واحد ہے۔ پس مجموع وحدتِ معروضہ مجموع وحدات عارضہ کے لئے معروض ہوگا اور مجموع وحدات عشرہ ہے پس عشرہ عارض عشرہ کے لئے ہوگا۔ پس عشرہ متکرر النوع ہوگا اور اسی طرح ہر واحد کا واحد آن واحد پر بحمل عرض محمول ہے۔ پس وحدات محمولہ مجموع عشرہ ہے جیسے کہ وحدات موضوعہ مجموع عشرہ ہے۔ پس عشرہ بحمل عرض علیٰ نفسہٖ محمول ہونے کی جہت متکرر النوع ہوگا اور ہر کلی متکرر النوع اعتباری ہوتی ہے کیونکہ اگر متکرر النوع اُمور انتزاعیہ سے نہ ہو بلکہ موجود فی الخارج ہو اور اپنی ذات اور عارض ذات کے لئے عارض ہو۔ تو یہ عروض دو حال سے خالی نہ ہوگا۔ انضمامی ہوگا یا انتزاعی۔ شق اول انضمامات غیر متناسبہ چاہتی ہے اور یہ مستلزم ہے کہ اشخاص موجودہ منضم فی الخارج مترتب بترتیب طبیعی ہوں کیونکہ اگر اس کا فرد پایا جائے اور اس کے لئے ایک عارض اور یہ فرد بھی موجود ہو تو اس عارض کے لئے ایک اور فرد عارض ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس پس تسلسل لازم آئیگا۔ اور شق ثانی بھی باطل ہے کیونکہ موجودہ خارجی انتزاعی نہیں ہوگا۔ عدد اُمور انتزاعیہ سے ہے اور ازیں جہت امر اعتباری ہے پس اگر واجب تعالیٰ کے لئے وحدت عددی مانی جائے۔ تو ایسی وحدت اعتباری ہوگی نہ کہ حقیقی"۔ (اثبات التثلیث صہ ۴۔ ۵)

جواب اس نمبر میں بھی وہی مغالطہ ہے کہ مفہوم اور مصداق میں فرق نہیں کیا گیا۔ واحد عدد ہو یا نہ ہو۔ عارض ہو یا انتزاعی ہو۔ اہل اسلام کو اس سے مطلب نہیں۔ وہ تو واحد کے مصداق کی نسبت قائل ہیں کہ اس میں کثرت بوجہ من الوجوہ نہیں۔ آپ کی ساری تقریر کا مدار اس پر ہے کہ واحد عدد ہے عدد بھی انتزاعی کہتے ہیں مگر توحید کا کرشمہ دیکھئے کہ واحد لاشریک نے آپ سے اس کا رد کر دیا۔ غور سے سنیئے۔ آپ مرقومہ عبارت کے ساتھ ہی لکھتے ہیں:

"محاسبین کے نزدیک تو واحد کوئی حقیقی عدد ہی نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک عدد وہ ہے جو اپنی بالائی اور زیریں دو طرف کا تیمہ مجموعہ ہو۔ جیسے دو۔ ایک اور تین کا نصف اور تین کا عدد دو اور چار کا نصف۔ وقس علیٰ ہذا۔" صہ

کیا خوب جو غیر پردہ کھولے جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے

سنیئے! جناب جب واحد عدد ہی نہیں۔ تو آپ کا سارا تار پود ٹوٹ گیا۔ جو واحد کے عدد ہونے پر مبنی تھا۔ پھر آپ کی یہ تفریع کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔ جو مذکورہ عبارت کے ساتھ ہی ملحق ہے کہ

"پس وحدت بغیر کثرت کے کوئی شے نہیں۔" (صہ)

ہم نہیں سمجھ سکتے۔ یہ تفریع آپ نے واحد کے عدد ہونے پر بٹھائی ہے۔ یا واحد کے غیر عدد ہونے پر دونوں باتوں کا احتمال ہے۔ سچ ہے

بات وہ کہہ۔ کہ نکلتے رہیں پہلو دونوں!

اے جناب! آپ جو ذات باری تعالیٰ کی نسبت بار بار کثرت بول رہے ہیں۔ اتنا بھی کبھی سوچا کہ یہ کثرت واجب تعالیٰ میں افرادی ہے۔ یا اجزائی۔ افرادی ہے تو کثرت آلہہ (متعدد خدا) کہنے سے کون امر آپ کو مانع ہو سکتا ہے؟ صاف کہیئے۔ کہ جس طرح انسان کثیر الافراد ہے۔ اس طرح واجب تعالیٰ بھی کثیر الافراد ہے تاکہ شرک اپنے کمال کو پہنچے۔ اور رذائل میں کمال نتیجہ پیدا کرے۔ اور اگر کثرت اجزائی ہے جیسا آپ کا یہ قول مظہر ہے کہ:

"واجب تعالیٰ کی وحدت اس معنیٰ کی ہے کہ وہ اپنی ذات میں بے مثل و بے مثنیٰ اور بلا شریک و بے عدیل و بے سہیم ہے۔ اور کثرت اس کی ذات میں بحیثیت اقانیم باطنیہ کے ہے نہ کہ باعتبار تعدد تکثر متخالفہ و متباینہ کے۔" (صہ ۱۶)

جواب عرب کے مشرک حج میں پکارا کرتے تھے:

لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَبَّیْکَ۔ لا شریک پر جب نہیں ...

تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے۔ بس کرو۔ یہاں ہی ٹھہرو۔ مگر وہ اس سے بھی کہ دیتے۔

اِلَّا شَرِیْکًا ہُوَ لَکَ تَمْلِکُہٗ وَمَا مَلَکَ (ہاں وہ تیرا شریک ہے جس کا تو ہی مالک ہے اور وہ مالک نہیں)

ایسا ہی ہم بھی پادری صاحبان کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ کیا اچھا ہو، کہ آپ بے سہیم پر عبارت ختم کر دیتے اور اقانیم کا جزو نہ ملایا کرتے۔

خیر یہ تو ہماری درخواست ہے جس کا قبول کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ مگر آپ کی عبارت سے نتیجہ نکالنا تو ہمارے اور ہر ناظر عبارت کے اختیار میں ہے کہ آپ ذات باری تعالیٰ میں کثرت اجزائی کے قائل ہیں۔ جب ہی تو آپ باوجود اقانیم ثلاثہ کے ذات باریتعالیٰ کو واحد کہہ کر اس کے حق میں بے مثل وحدت بولتے ہیں۔ پس اگر بے مثل وحدت میں کثرت اجزائی ہوئی تو واجب تعالیٰ کے مرکب ہونے میں کیا شک رہا؟ اور جو مرکب ہے وہ حادث ہے کیونکہ

کُلُّ مُرَکَّبٍ حَادِثٌ

مُسلّمہ قضیہ ہے۔ پس ثابت ہوا کہ عیسائی جس ذات واحد کو خدا مانتے ہیں۔ وہ مرکب ہونے کی وجہ سے حادث ہے۔ لہٰذا اس سے بالاتر کوئی ایسا خدا ضرور ہے جس نے اسے ترکیب دیا ہے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ دراصل خدا وہی ہے اور وہی اسلام کا خدا ہے جلّ جلالہ۔

ناظرین! یہ ہے عیسائی مذہب کا بنیادی پتھر جو اپنی کمزوری کی وجہ سے ریگ کی دیوار سے مشابہ ہے۔ صدق اللہ جل وعلیٰ

مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ ط

معلوم ہوتا ہے کہ پادری عبدالحق صاحب نے منطق کی چند ابتدائی کتابیں پڑھی ہیں۔ بہت اچھا کیا ہے۔ مگر اُن کے طرز کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو انھوں نے اس فن کو سمجھا نہیں، یا وہ بوجہ کمی سرمائے کے قادر کلام نہیں۔ گذشتہ جوابوں میں

بھی ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ آپ مفہوم اور مصداق میں فرق نہیں کرتے۔ جس کی مثال ہم نے دی تھی کہ "عبد الحق" کا مفہوم کیسا محبوب ہے۔ خاص کر مسلمان اس مفہوم کے دل سے مدّاح ہیں۔ لیکن "عبد الحق" کا مصداق وہ شخص جس نے اثبات التثلیث لکھی ہے۔ وہ مسلمانوں کو بوجہ اس کے غلط عقیدے کے ہرگز محبوب نہیں ہوسکتا۔ غالباً اس میں پادری صاحب کو بھی کلام نہ ہوگا۔ پس یہ ہے آپ کی ساری کتاب کی بناء غلط گذشتہ نمونوں کے علاوہ تیسرا نمونہ دیکھئے۔ پادری صاحب لکھتے ہیں:

"وحدت و کثرت امور اعتباریہ سے ہیں اور خارج میں ذاتاً متحقق نہیں بلکہ اُن کا علم اُس شئے کے علم پر موقوف ہوتا ہے جس سے ان کا قیام ہوتا ہے۔ (اور اگر وحدت و کثرت اعتباری نہ ہوں بلکہ موجود فی الخارج ہوں تو تسلسل لازم آتا ہے جو کہ باطل ہے اور بطلان لازم مستلزم بطلان ملزوم ہے۔ بیان ملازمت یہ ہے کہ اگر وحدت موجود فی الخارج ہو تو دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ یا واحد ہوگی۔ یا کثیر۔ اگر کثیر ہوگی تو لازم آئیگا کہ نفس شئے متغایر شئے ہو۔ کیونکہ کثرت مغائر وحدت ہے۔ جب کثیر ہونا باطل ہوا تو واحد ہوگی اور اس کے لئے ایک اور وحدت ہوگی جو نیز موجود فی الخارج ہوگی اور اس میں پھر وہی کلام ہوگا۔ حتیٰ کہ تسلسل لازم آئے گا۔ اور کثرت کا موجود فی الخارج ہونا اس طرح باطل ہے کہ اگر کثرت خارج میں موجود ہوگی تو وہ ہر اجزاء محل سے قائم ہوگی یا بعض اجزاء محل سے۔ بر تقدیر ثانی لازم آئے گا کہ کثیر واحد ہو اور بر تقدیر اوّل دو فساد لازم آئینگے۔ اوّل یہ کہ واحد کثیر ہوگا۔ دوم یہ کہ عرض واحد کئی محال سے قائم ہوگا۔ اور اس میں کلام نہیں ہوسکتا کہ کثرت وحدت کا مفہوم دو یا زیادہ متغائر اشیاء کے تقابل پر مبنی ہے جہاں تمیز نابود ہے۔ وہاں کثرت و وحدت بھی مفقود ہے۔ اس لئے عدم محض پر وحدت یا کثرت کا حکم نہیں لگا سکتے کیونکہ عدم محض میں کسی طرح کا تمائز متحقق نہیں۔ اور اگر عدم کو کسی معنی میں واحد یا کثیر کہنا درست ہے تو صرف بہ تقابل نقیض

یعنی وجود کے) پس کسی موجود پر واحد یا کثیر ہونے کا اطلاق بہ تقابل ومتغائر ومتبائن کے ہی ہوسکتا ہے۔ عام اس سے کہ تغائر وتبائن مشہوری ہو یا حقیقی۔ سو کوئی واحد یا تو اس حیثیت سے واحد ہوگا کہ وہ اپنی نوع کے کثیر افراد میں کا ایک فرد ہے۔ اب ایسے واحد کو واحد بالشخص کہیں گے۔ جیسے زید اور یا وہ واحد۔ واحد بالصنف ہوگا۔ جیسے مرد اور جو واحد بالصنف ہے۔ وہ کثیر بالشخص ہے، یا واحد بالنوع ہوگا۔ جیسے انسان۔ اور جو واحد بالنوع ہے۔ وہ کثیر بالصنف ہے۔ یا واحد بالجنس ہوگا۔ جیسے جاندار اور جو واحد بالجنس ہے۔ وہ کثیر بالنوع۔ وحدت کے اس مفہوم کی جو بہ تقابل وجودات حاصل ہوتا ہے یہی حیثیات ہیں۔ اور اعیان میں بھی وحدات متحقق ہیں۔ مگر ذات واجب تعالیٰ کی وحدت ان مفہومات سے منزہ ہے۔ کیونکہ واحد بالشخص ہونے سے لازم آئے گا کہ وہ کسی کلی متواطی کی طرف مضاف ہو۔ اور اسی طرح بالصنف بالنوع اور بالجنس ہونے سے اس کے لئے مماثلت مجانست اور مساوات لازم آتی ہے"۔

(اثبات التثلیث صہ ۶)

جواب اس اقتباس میں بھی وہی غلطی ہے جو آپ کو مفہوم اور مصداق میں عرصہ سے لاحق ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ واحد کے مفہوم پر آپ بے کھٹکے بحث کریں۔ اسے انتزاعی یا خارجی بتادیں۔ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ ہم تو واحد کے مصداق کے قائل ہیں۔ پس اس ساری تقریر میں آپ کا ایک ہی فقرہ قابل جواب ہے کہ:

"واجب تعالیٰ واحد بالشخص ہوگا تو کسی کلّی متواطی کی طرف مضاف ہوگا"۔

پہلے تو پادری صاحب سے پوچھتے ہیں کہ واحد بالشخص ہونے کو کلی متواطی سے کیا خصوصیت ہے۔ کیا کوئی واحد بالشخص کلّی مشکک کی طرف مضاف نہیں

ہوسکتا۔ مثلاً پادری کلّی مشکک ہے۔ تو کیا آپ اس کے فرد مضاف نہیں۔ خیر یہ تو لفظی مواخذہ ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ہم آپ کے اس سوال۔۔ ہیں۔ مگر کیا آپ کو معلوم نہیں کہ منطق کی چھوٹی چھوٹی کتابوں میں بھی لکھا ہے کہ واجب تعالیٰ کا مفہوم کلّی ہے لیکن مصداق واحد ہے۔ تہذیب المنطق ہی کو دیکھ ہوتا۔ تو آپ کو اس سوال کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ آپ کو وہاں ملتا کہ کلّی ایسی بھی ہوتی ہے جس کے کل افراد ممتنع ہوں، یا ایک پایا جائے، باقی محال ہوں۔ اس قسم سے واجب تعالےٰ ہے۔ کہئے کیا سوال؟

پادری صاحب نے اسلامی توحید پر اعتراض کرتے ہوتے لکھا ہے:۔

اہل اسلام کا خدا تعالیٰ کو واحد محض کہنا صرف ان کی خوش اعتقادی پر مبنی ہے ورنہ عقل کے نزدیک اُن کا یہ اعتقاد اعتقاد جازم غیر مطابق سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، اور یہ اعتقاد حقیقت و واقعیت کے سراسر خلاف و قیاس مع الفارق ہے اگرچہ علماء اسلام نے تثلیث فی التوحید کی تکذیب میں صفحوں کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں مگر کیا مجال کہ وحدت محضہ کی تعریف و تصدیق میں ایک لفظ بھی لکھنے کی جرأت کریں۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی مسلمان نے وحدت محضہ پر کچھ کہنے کی ہمت کی تو "سورۂ اخلاص" پڑھ کر سنائی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے، اللہ نرادھار ہے نہ کسی کو جنا۔ نہ کسی سے جنا اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں"۔ اسکی نسبت اول تو ہمیں یہ کہنا ہے کہ یہ کسی قسم کی تعریف ہے ہی نہیں۔ کیونکہ اسمیں صرف چند سوالبک بیان ہے۔ اور کسی چیز کی سلبی صفات بیان کرنے سے اسکی تعریف نہیں ہوسکتی۔ مثلاً انسان کے بارے میں یہ تعریف کسی کام کی نہیں کہ وہ گھوڑا، بندر، ہاتھی یا گدھا نہیں ہے۔ اگر قرآن کی یہ تعریف قبول بھی کر لی جائے تو بھی بدرجۂ غایت ناقص ہے۔ نہ جامع نہ مانع۔ جامع اس لئے نہیں کہ ان سلبی صفات کے علاوہ خدا تعالیٰ کے لئے اور بیشمار سلبی صفات ہیں۔ مثلاً لا جوہر ولا مصور، و لا مرکب ولا معدود ولا محدود، وعلیٰ ہذا، اور مانع بھی نہیں کیونکہ ابلیس کی نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ وہ کھاتا پیتا نہیں۔ نہ اس کا بیٹا ہے نہ باپ، نہ کفو ممتنع الوجود

کی بھی بعینہ یہی تعریف ہوسکتی ہے تو وجوب اور امتناع میں امتیاز کیا رہا؟
اور ظاہر ہے کہ یہ سلبی صفات کچھ خاصہ الوہیت نہیں۔ بلکہ اُن کا اطلاق غیر واجب
یعنی ممکن و ممتنع پر بھی ہوسکتا ہے۔ اور طرفہ امر یہ ہے کہ واحدِ محضہ کے بیان و
اظہار کے لئے کوئی خاص لفظ بھی قرآن میں موجود نہیں۔ چنانچہ لفظ واحد خدا اور
غیر خدا ہر دو کے لئے بولا گیا ہے۔ اور اسی طرح لفظ احد غیر خدا کلی کے لئے استعمال
کیا گیا ہے۔ جیسے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ اور نہ صرف احد کا لفظ
ہی رسول کلی کے لئے مستعمل ہوا ہے بلکہ اس کے ساتھ لفظ "بین" کے استعمال
نے وحدت محضہ کا پورا پورا ابطال کر دیا ہے۔" (اثبات التثلیث صہ)

جواب ماشاءاللہ جامع مانع تعریف کے معنی خوب جامع مانع سمجھے، کہتے ہیں
جامع اس لئے نہیں کہ ان سلبی صفات کے علاوہ اور بیشمار سلبی صفات ہیں۔ اس
سے معلوم ہوتا ہے کہ پادری صاحب کے نزدیک جامع کی جامعیت یہ ہے کہ وہ معرّف
کی کل صفات پر حاوی ہو۔

اے جناب! جامع تعریف وہ ہوتی ہے جو کل افراد پر حاوی ہو۔ کوئی اس سے باہر
نہ رہ جائے۔ غیر جامع تعریف وہ ہوتی ہے جس میں معرّف کے بعض افراد داخل ہوسکیں۔
مثلاً انسان کی یہ تعریف کہ وہ "حیوان ناطق بالفعل" ہے۔ غیر جامع ہے کیونکہ انسان کے
بہت سے افراد اس تعریف سے نکل جاتے ہیں۔ ایسا ہی مانع پر بھی آپ کا اعتراض بیجا
ہے۔ کیونکہ ابلیس کی ذریت کا قرآن میں ذکر ہے۔
اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ۔ یہ بھی آپ نے خوب کہا کہ یہ سلبی صفات
ممتنع پر بھی اطلاق ہوسکتی ہیں۔ کیا یوں کہیں گے کہ:
(مثلاً) اجتماع نقیضین بے اولاد ہے نہ وہ جنا ہے نہ اس کو کسی نے
جنا ہے وغیرہ کیا خوب!

اچھا صاحب! اگر سلبی صفات سے خدا کی تعریف ناجائز اور غیر مفید ہی
ہے تو میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ یہ آپ کا قول کیسے صحیح ہوگا جو آپ نے اسی رسالہ

میں لکھا ہے کہ اس خدا کی وحدت اس معنی کی ہے کہ وہ اپنی ذات میں بے مثل و بے مثنی اور بے شریک و بے عدیل و بے سہیم ہے"۔ (ص۶)

بتائیے یہ صفات سلبیہ ہیں یا وجودیہ؟

دیکھا نا! خدائے عالم الغیب کو علم تھا کہ آپ اسی کتب کے صفحہ ۸ پر صفات سلبیہ پر اعتراض کریں گے۔ اس کی غیرت نے تقاضا کیا۔ کہ صفحہ ۶ پر آپ ہی سے وہ الفاظ لکھا دیتے۔ جو آپ کا جواب ہیں۔

اب سنئیے! ہم آپ کو بتا دیں کہ قرآن مجید نے خدا جامع و مانع تعریف کیا کی ہے۔ غور سے سنیئے! قرآن شریف نے اس موضوع میں تین طریق اختیار کئے ہیں۔ مسل اور مجمل اور مجمل ترین۔ مفصل یہ ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ط هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ (سورۂ حشر ع ۳)

"وہ اللہ ایسا (پاک ذات) ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پوشیدہ اور ظاہر (سب) کا جاننے والا ہی بڑا مہربان ہی (اور) رحم والا ہے۔ وہ اللہ ایسا (پاک ذات) ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (تمام جہان کا) بادشاہ ہے۔ پاک ذات ہے (تمام) عیبوں سے بری ہے۔ امن دینے والا ہے۔ نگہبان ہے۔ زبردست ہے بڑا دباؤ والا ہی۔ بڑی عظمت رکھتا ہے۔ یہ لوگ جیسے جیسے شرک کرتے ہیں۔ اللہ (کی ذات) اُس سے پاک ہے۔ وہی اللہ (ہے جو) خالق (ہر چیز) کا موجد ہے۔ (مخلوقات کی طرح طرح کی) صورتیں بنانے والا ہی۔ (اس کی اچھی اچھی صفتیں ہیں۔ اور اسی سبب سے) سب اچھے نام اسی کے ہیں۔ جو (مخلوقات) آسمانوں (میں) اور زمین میں ہے۔ (سب ہی تو) اُس

کی تسبیح (و تقدیس) کرتے ہیں - اور وہ زبردست (اور) حکمت والا ہے"۔
کیئے! کیسی تفصیل ہے - مجمل کی مثال سنیئے - لَهُ الْاَسْمَآءُ
الْحُسْنٰى - (پ ۱۶، ع ۱۰)

مجمل ترین کی مثال سورۂ اخلاص میں ہے - جس کو آپ نے نہیں سمجھا - کیونکہ قرآن مجید کسی اُستاد سے نہیں پڑھا ہوگا - سنیئے:

ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ (یعنی تمام صفات کمال میں خدا اکیلا ہے)

ان تینوں تعریفات (مفصل، مجمل اور مجمل ترین) پر اعتراض کیجئے - اسی طرح آپ نے محض بے سمجھی سے "اَحَدٌ" کے لفظ پر اعتراض کر دیا کہ احد کا لفظ خدا اور غیر خدا پر بھی بولا جاتا ہے - ارے جناب! آپ کو معلوم نہیں کہ منطق میں ایک کلی ایسی ہوتی ہے جس کو مشکک کہتے ہیں - اس کے افراد میں اتنا بون بعید (فرق) ہوتا ہے کہ بظاہر عقل باور نہیں کرتی - کہ یہ افراد ایک کلی کے ماتحت ہوں مثلاً وجود یا موجود ایک کلی ہے جس کے افراد وجوب واجب بھی ہے اور وجود ممکن بھی - مگر وہ احد اور ہے - اور یہ احد اور ہے

شیر قالین دگر است - شیر نیستاں دگر است

مفصل سننا چاہیں تو سنیں - خدا احد بمعنی واحد بالذات جامع صفات کمال ہے اور مخلوق واحد بمعنی محض عددی - فافہم ماتوھم۔

پادری عبدالحق صاحب نے صفحہ ۱۱ پر فلسفہ کا ٹوٹا پھوٹا بلکہ غیر نافع اور غیر ضار اصول "الواحد لایصدر عنہ الا الواحد" لکھ کر اسی صفحہ پر ابطال توحید ان لفظوں میں کیا ہے - ناظرین بغور پڑھیں -

"اگر فرض کر لیا جائے کہ ذات واجب و خالق ہر طرح کی کثرت سے خالی ہے تو اس سے مخلوقات و ممکنات متکثر کا صدور بالضرورت محال ہے - کیونکہ سوال لازم آتا ہے کہ کثرت کا علم خالق کائنات کو ازل سے تھا یا نہیں؟ اگر نہیں تھا تو وہ اشیاء کثیر کا خالق نہیں ہو سکتا - ازیں جہت کہ علم کا

تقدم فعل خلق پر ضروری ہے۔ ورنہ خالق کے علم وارادہ کے بغیر مخلوق کا صدور ماننا پڑے گا۔ نیز عدم علم واجب سے اس کی ذات کا استکمال بغیر خود لازم آتا ہے کیونکہ جملہ کمالات سے ہے اور اگر پیدائش عالم سے پیشتر خالق کو علم کثرت کا تھا تو وہ ازلی و حضوری ہوگا۔ یا کسبی و حصولی۔ ازلی و حضوری تو ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ ذات واجب کثرت سے خالی مانی جاتی ہے۔ اور ماسوا معدوم۔ اور کسبی و حصولی ماننے سے ایک تو صفت علم کا غیر ذات ہونا لازم آئے گا دوسرے عیاذاً باللہ قبل از کسب و حصول علم اُس ذات علام و علیم کا جہل لازم آئے گا۔ اور ایسی صفت اگر ہو بھی تو انضمامی ہوگی نہ کہ ذاتی کیونکہ حصولِ صفت منضمہ ہے اور موصوف سے بالذات متاخر ہے پس اگر ذات واجب تعالیٰ کو ہر طرح کثرت سے خالی مانا جائے تو وہ کثرت کا عالم نہ ہوگا۔ یا ہوگا تو علم اس کی صفت منضمہ ہوگی۔ اور ... یا تو مخلوق میں کسی طرح کی کثرت پائی جائے گی۔ یا وہ کثرت خالق کے علم کے بغیر مخلوق میں خود بخود موجود ہو گئی ہوگی۔ چونکہ یہ سب شقیں فاسد ہیں۔ اس لئے واجب تعالیٰ کی وحدت میں کثرت متحقق ہے۔ (اثبات التثلیث صفحہ ۱۱، ۱۲)

جواب اس سارے اقتباس میں قابلِ توجہ عبارت صرف وہی ہے جس پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے۔ پادری صاحب کا مطلب صرف یہ ہے کہ: "ذات واحد میں معلومات کثیرہ کا علم نہیں آسکتا"۔ مگر اس اتنے بڑے دعویٰ کا ثبوت انھوں نے نہیں دیا جو اُن کے ذمہ تھا۔ کیونکہ ان کی پیش کردہ شقوں میں سے ہم اسی شق کو اختیار کرتے ہیں۔ یعنی ہم کہتے ہیں کہ "معلومات کا علم خدا کو ازلی اور حضوری ہے"۔

اس پر اعتراض کیا؟ کیا مخلوق واحد کو معلومات کثیرہ کا علم نہیں ہوتا؟ یہ کس نے کہہ دیا یا کس نے مان لیا ہے کہ واحد کو صرف واحد کا علم ہوتا ہی، حالانکہ مخلوق

بسی کثیر معلومات کا علم رکھتی ہے تو خالق ہیں اُبہ وصف نہ ہو، یا للعجب

علاوہ اس کے پادری صاحب سے ہم پوچھتے ہیں۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تثلیث بھی غلط ہے کیونکہ تثلیثی علما بھی تو ذات باری تعالیٰ کو انجام کار واحد کہتے ہیں۔ چنانچہ اسی کتاب "اثبات التثلیث" کے دیباچہ ہی میں درج ہے:

"واجب تعالیٰ واحد ہے"

تو اب پادری صاحب نے جو تخیلات شعریہ اسلامی توحید پر وارد کئے ہیں کیا وہ ان کی توحید پر بھی وارد نہ ہوں گے۔

اس سے آگے پادری صاحب لکھتے ہیں:

اگر اقانیم ثلثہ کا ذکر کیا جائے تو ذات ازلی وغیرہ محدود سے عالم حادث و محدود کا صدور ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ذات واجب کو اس عالم کی علت تامہ مانا جائے تو لازم آتا ہے کہ یہ عالم بھی ازلی ہو۔ اس لئے کہ فاعل ہر گاہ تام الفاعلیت ہو۔ اور اس کی تاثیر امرے از امور پر موقوف نہ ہو۔ اور جمیع ما یتوقف علیہ التاثیر اس کو حاصل ہو اُسے علت تامہ کہتے ہیں۔ اور علت جب تامہ ہو۔ اس سے تخلف معلول ممتنع ہوتا ہے یعنی جائز نہیں کہ علت تام ہو اور موقوف بر امرے از امور نہ ہو۔ اور مع ذلک ایک زمانہ گذر جائے اور معلول اس سے صادر نہ ہو۔ اور دوسرے زمانہ میں صادر ہو ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے۔

پس اس تقریر سے مندرجہ ذیل امور مبرہن ہوئے۔

(الف) اگر واجب تعالیٰ علت تامہ ہے اور عالم حادث اس کا معلول ہے تو لا محالہ افادہ ازلی نہ ہو لے اور وقت معین میں اس سے معلول کے صدور و حدوث کے لئے لازم محدثہ کی ضرورت ہے۔ ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی۔

(ب) علت محدثہ کا حدوث وصدور معلول کے وقت واجب ہے، ورنہ

تخلّف معلول از علّت تامہ لازم آئے گا۔

(ج) وہ علّت محدثہ غیر ذات علت مفیدہ نہ ہو۔ ورنہ علّت مفیدہ تامہ نہ رہیگی۔

(د) علّت محدثہ کا حدوث کسی علّت کا محتاج نہ ہو۔ ورنہ تسلسل لازم نہ آئیگا۔

(اثبات التثلیث صہ ۱۲)

جواب یہ ساری تقریر ایک اصولی غلطی پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ صفات باری تعالیٰ مثل خالقیت وغیرہ اضطراری ہیں یا اختیاری۔ اگر اضطراری ہیں تو یہ خرابی لازم آئے گی کہ دنیا کا نام ونشان بھی ظہور پذیر نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی ایک صفت مُحیی (زندہ کرنے کی) اگر دنیا کے وجود کو اضطراراً چاہتی تو دوسری صفت مُمیت (مارنے کی) بھی اسی اضطرار ہونے کی صورت میں اس صفت کے خلاف اپنا اثر دکھاتی، نتیجہ صاف ہوتا کہ دنیا کا وجود ہی نہ ہوسکتا۔ حالانکہ دنیا موجود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خدا کی صفات اضطراری نہیں بلکہ اختیاری ہیں۔

جب اختیاری ہیں تو۔ پادری صاحب کا اعتراض ترجیح بلا مرجّح کے متعلق سب کافور ہوگیا۔ کیونکہ موجودات کا پیدا کرنا اس کی صفت ارادہ کے ماتحت ہوا۔ اور ارادہ حکمت کاملہ کے ماتحت۔ پس موجودات مختصر بالزمان کے لئے اس کا ارادہ اور حکمت مرجّح ہیں اور کوئی نہیں۔ فاندفع ما اورد۔

عیسائی جواب چونکہ یہ اعتراض مشترک ہے جو پادری صاحب نے اسلام پر کیا ہے وہی عیسویت پر بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ خدا کی ذات انتہائی حالت میں اُن کے نزدیک بھی واحد ہے۔ اس لئے اس کا جو جواب پادری صاحب نے دیا۔ وہ بہت ہی قابل غور ہے۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں:

"(الف) علت محدثہ خدا کا کلام ہے۔ اسی کے وسیلے سے خدا باپ نے عالم پیدا کیے۔ (عبرانی ۱/۲۔ یوحنا ۱/۳ عبرانی ۱۱/۳ کلسی ۱/۱۶)

(ب) کلام خدا بوقت حدوث عالم خدا تعالیٰ سے صادر ہوا۔

(پیدائش ۱: ۳، ۶، ۹، ۱۱، ۱۴، ۲۰، ۲۴، ۲۶ کلسی ۱۵، ۱۷)

(ج) وہ کلام جس کے وسیلہ سے عالم پیدا ہوئے۔ کوئی یونانی یا عبرانی وغیرہ زبانوں کا لفظ نہیں تھا۔ کیونکہ الفاظ خود محدث و موضوع ہیں۔ وہ محدثات کی علت نہیں ہو سکتے۔ پس وہ کلام عین خدا تھا۔ (یوحنا ۱/۱) اور اس میں زندگی (بالوجوب) تھی۔ (یوحنا ۱:۴، ۵-۲۱، ۲۵، ۲۶)

(د) اس کا صدور کسی غیر کا محتاج نہیں۔ بلکہ وہ باپ سے صادر ہوا۔ (یوحنا ۱۶: ۲۷، ۲۸ سکاہ ۲۰۵) (اثبات التثلیث ص ۱۴)

جواب کیا ہی معقول جواب ہے جس سے اجتماع نقیضین کی تصویر بھی سامنے نظر آجاتی ہے۔

ناظرین! پادری صاحب کے بردو دعوے ملاحظہ فرمایئے!

(الف) کلام خدا سے صادر ہوا۔

(ب) کلام عین خدا ہے۔

کیوں جناب! صادر اور مصدور منہ میں وحدت کا قائل بجز آپ کے کوئی اور بھی ہے؟

پادری صاحب! ع

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے پہلے تو یہ دستور نہ تھا

بہت خوب! آپ نے محدثات کا حدوث کلام کے وسیلہ سے مانا ہے ہم نے صفت ارادہ کو مرجّح مانا ہے پس آپ خود ہی دیکھ لیجئے کہ معقول بات کونسی ہے کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ کلام کا درجہ (خواہ اس کو کسی عنوان سے مانیئے) ارادہ سے بعد کا ہے۔ ارادہ پہلے ہو تو کلام کا ظہور بعد ہوتا ہے۔ پس ارادہ اصل ہے اور کلام متفرع ہے۔ قرآن مجید اسی ترتیب کی طرف اشارہ کرنے کو فرماتا ہے۔

"اِنَّمَا اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ" یعنی کسی چیز کو جب خدا

پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسے صرف اتنا کہتا ہے کہ ہو جا۔ پس وہ ہو جاتی ہے"۔
صدق اللہ جل جلالہٗ۔

پھر پادری صاحب لکھتے ہیں :

"ثالوث اقدس کے مخالفین باوجود واجب تعالیٰ کو احد یا واحد محض ماننے کے اُس کی ذات میں کثرت صفات کے بھی قائل ہیں۔ اور جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ ذات احد میں کثرت صفات کیسی؟ تو جواب دیتے ہیں کہ جیسے ایک شخص مثلاً زید متعدد صفات کا محلّ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح واحد حقیقی میں بھی تعدد صفات خلاف عقل نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ شخص زید جس کو متعدد صفات کا محل کہتے ہو۔ واحد محض نہیں ہے اور واجب تعالیٰ کو واحد محض کہا جاتا ہے۔ علاوہ بریں وہ صفات متعدد شخص معروض کی ذاتیات سے خارج یعنی از قسم عرضیات ہونگی حالانکہ ذات واجب تعالیٰ محل اعراض نہیں اور صفات غیر واجب ہو نہیں سکتی۔ ورنہ متعدد ازلی ہستیاں سوائے ذات واحد کے ماننی پڑینگی پس وہ ضرور عین ذات ہونگی اور ذات احد کا عین کثیر ہونا غیر ممکن و محال مطلق ہے۔ پس یا تو خدا تعالیٰ کو نرگُن یا خالی از صفات مانو جس کا عدم وجود برابر ہوگا اور یا صفات کی کثرت مان کر اُس کی ذات میں بھی کثرت کے قائل ہو جاؤ"۔ (اثبات التثلیث ص۱۴)

جواب خدا کی صفات کے متعلق متکلمین میں کئی مذاہب ہیں (۱) صفات زائد از ذات ہیں۔ (۲) صفات عین ذات ہیں۔ (۳) صفات نہ عین ذات ہیں نہ یہ اختلاف ابتدا میں ہی۔ انتہا میں یعنی نتیجہ میں کوئی اختلاف نہیں۔ صفات الٰہیہ کا اثر سب برابر مانتے ہیں۔ مثلاً علم الٰہی ایک صفت ہے۔ اس کی بابت اتنا تو اختلاف ہے کہ عین ذات ہے یا غیر۔ اس میں اختلاف نہیں کہ اس صفت کا اثر برابر پایا جاتا ہے معترض کا اعتراض ان تینوں مذہبوں سے کسی مذہب کو ے کر بھی اُٹھ سکتا ہے۔ مگر عین ذات کہنے سے بہت واضح تردید ہوتی ہے یعنی ذات خدا بحیثیت

انکشاف ہونے کے عالم ہے۔ بحیثیت خلق کرنے کے خالق ہے۔ علیٰ ہذا القیاس
پس اس اصول کے لحاظ سے ذاتِ الٰہی میں نہ محلّیت اعراض ہونے کا احتمال
ہوتا ہے نہ تعدد کا خیال۔ فاندفع ماورد
ہم حیران ہیں کہ ہمارے دوست کن حیلوں سے ذات الٰہی میں کثرت کا ثبوت
دیتے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں

"ڈوبتے کو تنکے کا سہارا"

پادری صاحب کے الفاظ اس بارے میں یہ ہیں:

(۱) "کلام مقدس (بائیبل) سے یہ معرفت حاصل ہوتی ہے کہ ذات الوہیت میں
باپ بیٹا روح القدس تین اقنوم[1] ہیں۔ اور ان اقانیم کا امتیاز بطون ذات
میں ہے کسی خارجی مابہ الامتیاز کا گذر نہیں۔ اور نہ کسی بیرونی تفریق کو
اس میں راہ ہے۔ اقنوم اول کو لفظ باپ۔ اقنوم ثانی کو کلام ——
—— اور اقنوم ثالث کو روح القدس سے تعبیر کیا گیا ہے۔
اقنوم اوّل اس لئے باپ ہے کہ اقنوم ثانی یعنی کلام اس سے صادر ہوا۔
اسی لئے اقنوم ثانی مولود[2] اور اکلوتا[3] بیٹا کہلاتا ہے۔ اور اقنوم ثالث
باپ اور بیٹے کی روح[4]۔ اور جس طرح کلام مقدس میں باپ کو خدا اور خداوند
کہا گیا ہے اسی طرح کلام یا بیٹے[5] اور روح القدس[6] کو بھی خدا اور خداوند کہا گیا۔
مسئلہ تثلیث فی التوحید کے مخالفین بھی خدا کے کلام کے قائل ہیں مگر وہ

---

[1] متی ۲۸، ۲۹ ب۔
[2] کلسی ۱: ۱۵۔
[3] یوحنا ۱: ۱۸۔
[4] اعمال ۱۶: ۶، ۷ رومی ۸: ۹
[5] یوحنا ۱: ۱ و ۲۰ و ۲۸۔ رومی ۵۱۹۔ عبرانی ۸۰۱۔ پطرس ۱۱۱
[6] یوحنا ۴، ۲۴۔ اعمال ۵: ۳، ۴۔ ۲ قرنتی ۳: ۱۷، ۱۸: ۱۲ منہ

بجائے خدا کی روح کے خدا کی حیات مانتے ہیں لیکن اُن کے اس گمان پر کلام مقدس کے بیان کو بالبداہت فضیلت حاصل ہی۔ ازیں جہت کہ روح بہ نسبت حیات اعمّ ہے۔ کیونکہ ذی حیات تو حیوان مطلق اور درخت بھی ہیں۔ مگر ذی روح اس عالم سفلی میں صرف انسان ہی ہی جو اپنے خالق کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے پس اگر خدا تعالیٰ کو ذی حیات کہنا جائز ہے تو کیوں ذی روح کہنا جائز نہیں۔ ہر ذی روح ذی حیات ضرور ہوتا ہے مگر ہر ذی حیات ذی روح نہیں ہوتا۔ اگر خدا ذی روح ہے تو ضرور ذی حیات بھی ہی لیکن اگر صرف ذی حیات مانا جائے تو اس کے لئے عمومیت اور جزویت کا نقص لازم آئیگا۔ سو خدا کے کلام اور اس کی روح کے وجود سے ہمارے مخالفین کو بھی انکار کی راہ نہیں اسلئے ہمارے اور ان کے درمیان صرف یہ مابہ النزاع باقی ہی کہ آیا کلام و روح کو خدا تعالیٰ کے اقنوم کہنا درست ہے یا صفت قرار دینا"

(اثبات التثلیث صفحہ ۱۶)

جواب یہ دلیل دراصل نقلی ہے۔ یعنی بائیبل سے ماخوذ ہے اس لئے اس کا جواب دینا اگر ضروری ہے تو یہودیوں اور عیسائیوں کے فرقہ یونیٹیرین پر ہے ہم مسلمان اس کے جواب دہ نہیں۔ بلکہ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہی ہی کہ جس کتاب میں ایسی تعلیم (تثلیث کی) ہے وہ الہامی ماننے کے قابل نہیں۔ اور بس اس اجمالی جواب کے بعد بھی ہم کچھ بتانا چاہتے ہیں۔

ہم مسلمانوں کو خدا کے کلام سے انکار نہیں۔ لیکن نزاع (جیسا کہ آپ نے بھی اظہار کیا ہے) اسی میں ہے کہ کلام یا روح خدا کے اقنوم (حصے) ہیں۔ یا صفات ہیں۔ ہم ان کو حصے نہیں مانتے۔ مسیحی علماء ان کو حصے (اقنوم) کہتے ہیں۔ اسی کا نام ان کے ہاں تثلیث ہے۔ عیسائی حوالہ جات کے مقابلہ میں اسلامی حوالہ جات بھی قابل شنید ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ۔ یعنی خدا کی نسبت تثلیث کا

عقیدہ رکھنے والے دراصل خدا کے منکر ہیں"۔

بس ان حوالہ جات کا فیصلہ حوالوں سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان نقلی حوالوں میں سے صحیح بات وہی ہو گی جس کی تائید عقلی دلیل سے ہو گی۔ چنانچہ اس کا ذکر پہلے نمبروں میں ہوتا رہا۔

اخیر میں ہم اسلامی اور مسیحی عقیدہ مقابلہ میں رکھ دیتے ہیں۔ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔

اسلامی عقیدہ

"اللہ ایک ہے۔ بے نیاز ہے۔ نہ کسی کا باپ ہے۔ نہ کسی کا بیٹا۔ نہ اُس کی ذات برادری کا کوئی ہے۔ (سورۂ اخلاص)

عیسائی عقیدہ

"باپ خداوند۔ بیٹا خداوند۔ روح القدس خداوند۔ تو بھی تین خداوند نہیں، بلکہ ایک خداوند۔ باپ ازلی۔ بیٹا ازلی۔ روح القدس ازلی۔ تو بھی تین ازلی نہیں، بلکہ ایک ازلی۔ باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق۔ روح قدس قادر مطلق۔ تو بھی تین قادر مطلق نہیں۔ بلکہ ایک قادر مطلق"۔ (مفصل صہ ۱۶ کتاب ہذا)

ناظرین! ان دونوں عقیدوں کو مقابلہ میں رکھ کر جو آپ کی عقل میں قابلِ قبول ہو، اُسے قبول فرمائیں۔ اور ناقابل قبول کو رد کریں ؎

من نہ گویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بیں و کارِ آساں کن

تم کیوں عیسائی ہوئے؟

بجواب

میں کیوں مسیحی ہوا؟

دیباچہ میں ہم بتا آئے ہیں کہ پادری سلطان محمدؐ صاحب پال جو مسلم سے عیسائی بنے ہیں۔ آپ نے ایک ٹریکٹ اس نام کا لکھا ہے کہ مَیں کیوں مسیحی ہوا؟ بمقام حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ (پنجاب) میں پادری صاحب جب مباحثہ میں ناکام رہے تو بطور چیلنج یہ رسالہ پھینکا کہ ہمت ہے تو اس کا جواب دو۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ ہم نے اس رسالہ کو عیسائیوں کی دوسری کتابوں کی طرح معمولی جان کر نظر انداز کر دیا تھا مگر ۳ ستمبر ۱۹۲۸ء[1] کو حافظ آباد (پنجاب) کے مباحثہ میں پادری صاحب نے اس رسالہ کو بڑا مایۂ ناز جان کر جواب طلب کیا اور جواب کی تنقید کے لئے پنڈت رام چندر جی دہلوی آریہ کا نام بطور منصف پیش کیا۔ جسے ہم نے تسلیم کیا، لیکن جونہی ہم نے منظوری دی پادری صاحب نے یہ پخ لگا دی کہ میرا جواب الجواب ساتھ ہوگا۔ ہم نے کہا۔ آپنے جواب کی تنقید کے لئے منصف مانا ہے پھر جواب الجواب [illegible] وں؟ مگر پادری صاحب نے ایک نہ سُنی۔ اسلئے تقرر منصف کا مسئلہ طے نہ ہوا مگر پادری صاحب گھر پہنچکر بھی اسی بات پر جمے رہے کہ ہمارا جواب الجواب ساتھ ہو۔ چنانچہ آپنے (عیسائی) اخبار نور افشاں لاہور۔ مورخہ ۴ جنوری ۱۹۲۸ء کے صفحہ ۲ کالم ۳ پر یوں اظہار رائے کیا:۔

"جو کچھ آپ (ثناء اللہ) نے لکھا ہے ہم اس کو اپنے مختصر ریمارک کے ساتھ

---

[1] اس مباحثہ کی روداد اخبار اہلحدیث ۲۸ ستمبر ۱۹۲۸ء میں درج ہوئی تھی اور اس روداد کی تصدیق مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے ۱۶ نومبر ۱۹۲۸ء کے اہلحدیث میں درج ہو چکی ہے۔ منہ

ہدیہ ناظرین کرتے ہیں اور جب یہ مضمون مکمل ہو جائے تو بغرض تصفیہ ہم اس کو احادیث کے فائل کے ساتھ پنڈت رامچندر جی دہلوی کے پاس بھیجدیں گے۔ کیونکہ دونوں کے نزدیک آپ (پنڈت جی) منصف مقرر ہو چکے ہیں"۔ (رسالہ شیر افگن ص۴)

حالانکہ طریق مناظرہ اور قانون عدالت مروجہ یہ ہے کہ مجیب کی تقریر آخری ہوتی ہے لیکن پادری صاحب نے اپنی کمزوری کو جان کر اسے قوت پہنچانے کے لئے یہ تجویز نکالی کہ اُن کا جواب الجواب پیچھے رہے جو ساری دنیا کے اصول کلام کے خلاف ہے۔

پھر لطف یہ ہے کہ جنوری ۱۹۲۸ء کو آج تین سال ہو گئے ہیں لیکن پادری صاحب نے اپنا قول (ہم پنڈت رامچندر سے فیصلہ کرائینگے) صحیح ثابت نہ کیا۔ گو اس صورت میں پنڈت جی کا فیصلہ بوجہ عدم منظوری شرط ناجائز کے ہم پر حجت نہ ہوتا لیکن پادری صاحب کو تو اپنے قول کی پاسداری کرنی چاہیئے تھی۔ تاکہ ناظرین آپ کو یہ نہ کہتے ؎

بے وفا کونسی خوبی ہے نہیں جو تجھ میں
وصف اتنے ہیں جہاں ایک وفا اور نہیں

پادری صاحب کو میرے متعلق ایک بڑی تکلیف ہوئی۔ وہ یہ کہ میری ذات خاص کے برخلاف شہادت فراہم کرنے کو انہیں قادیان تک کی خاک چھاننی پڑی۔ یعنی میرے جواب کے لئے قادیانی رسالہ آئینہ حق نما (بجواب الہامات مرزا) سے میرے حق میں بدگوئی کا مواد جمع کیا۔ جس کے لئے میں خود محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے یقیناً اپنے ضمیر کے خلاف کیا۔ ورنہ قادیانی شہادت گر مجھے کسی طرح مضر ہے تو پادری صاحب بلکہ جملہ مسیحیان دنیا کے لئے زیادہ مضر ہے کیونکہ قادیان نے مسیح موعود جناب مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے الفاظ یعنی عیسی مسیح یہ ہیں:

"مسیح کا چال چلن کیا تھا۔ ایک کھاؤ۔ پیو۔ شرابی۔ نہ زاہد۔ نہ عابد نہ حق کا پرستار متکبر۔ خود بین۔ غیرہ (نقل کفر کفر نباشد)۔ مکتوبات احمدیہ قادیانی جلد ۳ ص ۲۳

ا؎ پادری صاحب نے محمد امین محمد رجہ نور افشاں کو رسالہ کی صورت میں شائع کیا حق کا برنام ہے

پادری صاحب: ع مشکل بہت پڑے گی۔ برابر کی چوٹ ہے
آئینہ دیکھئے گا ذرا دیکھ بھال کر

مختصر یہ کہ پادری پال صاحب نے ثالث کا نام پیش کر کے ناجائز شرط لگا کر اس کو ٹلایا۔ پھر آپ ہی بزعم خود اُس کو بحال کیا۔ مگر عمل نہ کیا تو بے ساختہ ہمارے منہ سے نکلا ؎

اَنْتَ جَمِیْلُ الْوَجْہِ مُسْتَحْسَنُ الْکِذْب

ہاں آپ نے جواب الجواب (ناصواب) کو رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا جس کا نام رکھا "شیر افگن"۔ اس لئے ہم بھی اپنا مضمون مع مختصر جواب کے رسالہ ہذا کی صورت میں شائع کرتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

بروزِ حشر گر پرسند خسرو را چرا کشتی :: چہ خواہی گفت قربانت شوم تا من بگویم

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِکِ النَّاسِ ط اِلٰهِ النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ ط

ناظرین کرام کو یاد ہو گا کہ اہلحدیث مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۸ء میں ایک کھلا مکتوب بنام پادری سلطان محمد افغان کے نام درج ہوا تھا جو ناظرین کی یاد تازہ کرنے کو مکرر نقل ہے۔

کھلا مکتوب

بخدمت پادری سلطان محمد صاحب پال۔ تسلیم! آپ نے مباحثہ ی ظفر آباد ضلع گوجرانوالہ (پنجاب) بتاریخ ۳ ستمبر ۱۹۲۸ء اپنی مذہبی تحقیق کا اظہار کرتے ہوئے اپنا رسالہ "میں مسیحی کیوں ہوا" میری طرف پھینک کر کہا تھا۔ اگر آپ اس کا جواب دیں تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ چنانچہ اس وقت بہت سی قیل و قال کے بعد غیر منصف بھی ہو دیکھ گیا۔ میں اس کا ذکر چھوڑتا ہوں تاکہ سلسلہ کلام اور طرف نہ ہو جائے بلکہ درد بھرے دل سے آپ کو مخاطب کرتا ہوں اور صرف ایک بات نہایت ہی مخلصانہ رنگ میں پوچھتا ہوں کہ آپ اس رسالہ کا جواب پا کر منتہائے کلام

کیا قرار دیتے ہیں اور فیصلہ کی صورت کیا فرماتے ہیں۔

مَیں امید کرتا ہوں کہ آپ میرے اس محبت نامہ کا جواب مودّت کے رنگ میں معقول دیں گے۔ (آپ کا باوفا ابوالوفا ثناء اللہ)

اس کے جواب میں پادری صاحب نے جو خط لکھا۔ وہ اصلی واقعہ سے بالکل اجنبی ہے۔ پادری صاحب لکھتے ہیں۔ جب مَیں (پادری) نے آپ (مولوی) کو للکار کر کہا:

"آپ مجھے یہ تو بتائیں کہ تقریری مباحثہ سے آپ کیوں بھاگتے ہیں اور آپ ہی کہتے رہے کہ مباحثہ تحریری ہو۔ اس پر مَیں نے اپنا رسالہ "مَیں کیوں مسیحی ہو گیا" آپ کی طرف پھینک کر کہا کہ اگر آپ کو تحریری مباحثہ کا اس قدر شوق ہے تو یہ میرا رسالہ ہے کہ اس میں نجات پر ہی بحث ہے اور سات سال سے آپ کی چھاتی پر مونگ دل رہا ہے۔ آپ اس کا جواب لکھ دیں تو پبلک خود ہی فیصلہ کر لیگی۔ اگر آپ کا جواب اس قدر معقول ہو۔ کہ میرا قلم پھر اس پر نہ اُٹھ سکے تو مَیں مسلمان ہو جاؤنگا۔ لیکن آپ کیا، اگر دنیا بھر کے مسلمان ملجائیں تو بھی اس کا جواب نہ دے سکینگے۔ اگر آپ میں کچھ بھی دم ہوتا تو اس سات سال کے عرصہ میں اس کا جواب ضرور شائع کرتے اور آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ آپ اس رسالہ سے بیخبر ہیں کیونکہ آپ کے اخبار میں اس کا تذکرہ ہو چکا ہے اور مَیں نے موضع مہان سنگھ کے قلعے میں بھی جو گوجرانوالہ کے متصل ہے پارسال آپ کو انہی الفاظ میں بھری مجلس میں چیلنج دیا تھا جس کے جواب میں آپ ابتک خاموش ہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ دیکھئے مولوی صاحب! اس موقعہ کو آپ ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ کیونکہ میرے مسلمان بنانے میں آپ کی بیحد شہرت ہوگی۔ اور آمدنی میں اضافہ۔

جواب اس جواب میں پادری صاحب نے منصفہ کے تقرر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ اصلی خط و کتابت میں، سے جو اس جلسہ میں سوتی تھی۔ اثناءِ مباحثہ میں میرا لکھا ہوا خط ملاحظہ ہو:

پادری سلطان محمدؐ خاں صاحب

تسلیم! آپ نے جو اپنے رسالہ "میں کیوں مسیحی ہوا" کے متعلق تحدّی (چیلنج) کی ہے کہ مولوی ثناء اللہ اس کا جواب دیں گے تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ اور جواب کی صحت کے لئے پنڈت رامچندر جی دہلوی کو منصف پیش کیا ہے۔ مجھے یہ منظور ہے میں اس کا جواب لکھ کر پنڈت جی کے پاس بغرض فیصلہ بھیجدونگا۔ اور فیصلہ فریقین کے خرچ سے شائع ہوگا۔ پس آپ بھی اس خط پر دستخط کر کے بھیجدیں۔

(ابوالوفاء ثناء اللہ ۲۸/۹/۲)

تصدیق واقعات مندرجہ ذیل صحیح ہیں:

(۱) محمدؐ حیات خاں پریذیڈنٹ جلسہ۔ (۲) مولوی عبدالرحمٰن خلیل نظام آبادی۔ (۳) حافظ عنایت اللہ (گجراتی)۔ (۴) محمدؐ اشرف انسپکٹر کواپریٹو سوسائٹی۔

اس کا جواب جو پادری صاحب نے اسی جلسہ میں بمشورہ اپنے ہمراہیوں کے دیا تھا۔ وہ درج ذیل ہے:

بخدمت مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری

تسلیم! آپ کا یہ لکھنا کہ آپ نے رسالہ "میں کیوں مسیحی ہوا" کے متعلق تحدّی کی ہے سراسر غلط ہے۔ اور تعجب ہے کہ اس قدر جمّ غفیر کے سامنے اس خلاف واقعہ امر کے لکھنے کی جرأت ہوئی۔ درحقیقت مجھ کو اپنا رسالہ "میں مسیحی کیوں ہوا؟" کا دینا آپ کے چیلنج کا جواب تھا کہ جب آپ نے تقریری مباحثہ سے گریز کیا۔ اور تحریری مباحثہ پر اصرار کیا۔ تب میں نے اس رسالہ کو پھینک کر اس کے ساتھ یہ کہا کہ اگر آپ کو تحریری مباحثہ پر اصرار ہے تو آپ اس رسالہ کا جواب لکھیں۔ پبلک خود فیصلہ کریگی۔ اگر آپ کا جواب معقول ہوگا اور میں جواب نہ دے سکوں تو میں مسلمان ہو جاؤنگا جس پر اب تک قائم ہوں۔ اور تحدّی کے ساتھ کہتا ہوں کہ جب سات سال سے اس کا جواب آپ نہ دے سکے تو اب کیا دیں گے۔ تاہم اگر پنڈت رامچندر جی دہلوی مجھ کو یہ لکھ دیں کہ وہ میرے جواب الجواب کے بغیر فیصلہ کر دیں گے تو اُن کا یہ فیصلہ بھی

مجھے منظور ہوگا۔ اب میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ تقریری مباحثہ سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ میرا چیلنج تو آپ کے ساتھ تقریری مباحثہ پر ہے اور میں پھر آپ کو چیلنج دیتا ہوں کہ تقریری مباحثہ میں اگر آپ یہ ثابت کرسکیں کہ اسلام میں نجات مکمل طور پر موجود ہے اور پنڈت رامچندر جی فیصلہ دیں کہ مولوی ثناء اللہ نے اسلام میں نجات کو ثابت کردیا تو خوشی کے ساتھ میں مسلمان ہونگا اور میرے مسلمان بنانے میں آپ کی بڑی شہرت ہوگی۔ اور اگر رامچندر جی یہ فیصلہ دیں کہ مولوی ثناء اللہ اسلام میں نجات ثابت کرنے سے قاصر رہے تو ایمانداری یہ ہے کہ آپ دین برحق مسیحیت کو اختیار کریں اور اسلام کو ترک کریں۔ پنڈت رامچندر جی کے اخراجات طرفین کے ذمہ ہونگے۔ اور یہ تقریری مباحثہ ۱۵ ستمبر سے پیشتر حافظ آباد میں ہوگا۔ فقط
سلطان محمد خان افغان حافظ آباد۔ ۳ ستمبر ۱۹۲۸ء

مسلمان پادری صاحب چونکہ واقعہ کے خلاف بات بناتے ہیں۔ اس لئے وہ بنتی نہیں۔ ان کی پہلی تحریر میں تقرر منصف کا کوئی ذکر نہیں۔ ناظرین میری طرح اسے بغور پڑھیں۔ اس دوسری تحریر میں جو جلسہ میں انھوں نے دی تھی۔ پنڈت رامچندر جی کو منصف ماننے کا ذکر ہے مگر اس میں واقعہ کو بگاڑ کر چونکہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لہذا وہ بنا نہیں۔ مثلاً فقرات ۱، ۲ ملاحظہ ہوں۔ آپ تحریری مباحثہ کے جواب میں رسالہ بھیجنے اور تحریری جواب طلب کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

(۱) اگر پنڈت رامچندر جی دہلوی یہ لکھ دیں کہ وہ میرے جواب الجواب کے بغیر فیصلہ دینگے۔ تو اُن کا یہ فیصلہ بھی مجھے منظور ہوگا۔"

اس فقرے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی تحریری مباحثہ میں فیصلہ کرنے کے منصف ہونگے۔ اب اسی چٹھی کا دوسرا فقرہ ملاحظہ ہو۔ پادری صاحب لکھتے ہیں:

(۲) میرا چیلنج تو آپ کے ساتھ تقریری مباحثہ پر ہے۔ اگر رامچندر جی یہ فیصلہ دیں کہ ثناء اللہ صاحب نجات ثابت کرنے سے قاصر رہے الخ

ناظرین! اپنائیے یہ اختلاف تخالف پواد رہے، یا تہافت فلاسفہ ہے۔
یہ ایک ہی خط میں جو بھری مجلس مباحثہ میں میرے سامنے میرے جواب میں لکھا
دو متضاد فقرے (الامان) بہرحال منصف کا تقرر مانا۔ لیکن بعد جلسہ کے جب
مکان پر آرام سے بیٹھے تو دوسرے خط میں جو اس کتاب میں اوّل جگہ درج ہوا
ہے۔ تقرر منصف کا ذکر ہی حذف کر گئے۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ ؕ

سچ ہے ؎ نہ خنجر اُٹھے گا نہ تلوار ان سے
یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

مختصر یہ کہ حقیقت اور نفس الامری واقعہ صرف یہ ہے کہ پادری صاحب
نے اپنا رسالہ ہماری طرف پھینک کر کہا:

"اس کا جواب دو گے تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ منصف آریوں یا
برہمو قسم میں سے کوئی ہوگا۔ میں نے برہموؤں کا نام لیا۔ پادری صاحب نے
منظور نہ کیا۔ بلکہ پنڈت رامچندر جی آریہ پر زور دیا۔ بعد قیل و قال میں نے
پنڈت جی دہلوی کو منظور کر کے مندرجہ بالا خط لکھا۔ جس پر صدر جلسہ
اور دیگر معززین کے دستخط ہیں۔ خیر جو کچھ ہوا۔ عالم الغیب اور حاضرین
جلسہ کو معلوم ہے۔

اعلان میں اب پادری صاحب کے دونوں قسموں کے جواب دینے کو
تیار ہوں۔ بے شک حافظ آباد میں تقریری مباحثہ کریں۔ اور
پنڈت رامچندر جی کو بطور منصف درمیان میں بٹھالیں۔ ان کے نصف اخراجات
کے متحمل مسلمانان حافظ آباد ہو چکے ہیں۔ نصف کے آپ ہونگے۔ ہاں یہ شرط
ضروری ہے کہ مباحثہ چاہے تقریری ہو لیکن فیصلہ تحریری لیا جائے گا جس کی
صورت یہ ہوگی کہ منصف صاحب فیصلہ کی دستخطی نقل ایک ایک فریقین کو دیں گے اور ایک
جلسہ عام میں سُنا کر اپنے پاس رکھیں گے۔

پنڈت رامچندر جی کے ساتھ خط و کتابت کرنے کے لئے مسلمانان حافظ آباد کی طرف سے مولوی علم الدین صاحب ہونگے۔ آپ اپنی طرف سے جس کو چاہیں مقرر کر دیں۔ دونوں مل کر مراسلت کریں گے۔

یہ تو ہو آپکے مبادی کا جواب۔ اب میں آپکے رسالہ کا جواب شروع کرتا ہوں بحولہ و قوتہ۔

معذرت: سچ تو یہ ہے کہ آج تک آپ کے رسالہ کا جواب عدم توجہ سے نہیں دیا گیا[1] ورنہ اور کوئی بات نہیں۔ بہر حال اس میں شک ہے کہ اس کا جواب دینا ہم پر قرض واجب الادا ہی جو آج ہم مع سود ادا کرتے ہیں۔

خلاصہ مضمون رسالہ: پادری صاحب کا رسالہ تقطیع خورد ۴۷ صفحے ہیں جن میں سے ۱۹ صفحات تک اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے۔

بائیس ۲۲ سال کی عمر میں عربی علوم پڑھ کر عیسائی ہوئے ہیں۔

عجیب مطابقت اسی بائیس سالہ عمر میں ہمارا ایک عزیز عبدالغفور بی اے دھرمپال بنا تھا جس کے جواب (ترک اسلام) کے دیباچہ میں ہم نے وجدانی پیشینگوئی کی تھی کہ اگر انہی وجوہات پر اسلام سے برگشتہ ہوئے ہو تو جوابات سن کر بہت جلد اسلام میں آجاؤ گے چنانچہ وہ آگئے اور آج بفضلہ تعالیٰ غازی محمود کے اسم سے موسوم ہیں۔

اسی طرح پادری صاحب کے حق میں بھی سعادت ازلی سے امید ہونی چاہیئے کہ آپ کو کھینچ لے گی ؎

کشش ہے جذب الفت میں تو کھنچ کر آہی جائیں گے
ہمیں پرواہ نہیں گر ہم سے کچھ وہ تنکے بیٹھے ہیں!

۱۹ صفحات کے بعد آپ نے اپنی مذہبی تحقیق جو لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"اسلام میں نجات عملوں پر ہے اور عیسویت میں نجات مسیح کے کفارہ پر لہذا میں عیسائی ہو گیا"۔

ملخص جواب یہ ہے کہ عیسے مسیح علیہ السلام نے بھی اعمال شرعیہ پر عمل کرنے کی بہت تاکید کی ہے چنانچہ آپکے الفاظ یہ ہیں:

[1] بعد میں معلوم ہوا تھا کہ پادری صاحب کا جواب دیا گیا ہے۔ جواب کا نام "صاعقہ ذوالجلال بجواب پادری مال" ہے۔ مصنف

"تو زندگی میں داخل ہوا چاہتا ہے تو حکموں پر عمل کر" انجیل متی ۱۹ باب کی ۱۸"

بس مختصر جواب تو یہی ہے کہ جس وجہ سے آپ نے اسلام کو چھوڑا۔ یعنی احکام شرعیہ پر عمل کرنے سے آپ خوفزدہ ہوئے۔ وہی خوف انجیل میں بھی ہے۔ بس آپ قرآن و انجیل کی تعلیم کو انصاف سے دیکھئے اور اس شعر پر غور کیجئے ؎

جی عبادت سے چرانا اور جنت کی ہوس
کام چور اس کام پر کس منہ سے اُجرت کی ہوس

پادری صاحب نے اظہار کیا ہے کہ میں نے نجات کی تلاش میں پارسیوں کی کتاب دیکھی تو "دساتیر کے مطالعہ کرنے اور پارسی علما کے ساتھ گفتگو کرنے سے مجھ کو نجات کی بابت حد سے زیادہ مایوسی ہوئی۔ اس مذہب میں نجات حاصل کرنے کی کوئی معقول تدبیر نہیں بتلائی گئی ہے۔ کہیں تو نجات بالاعمال کا ذکر ہے اور کہیں تناسخ پر دارومدار ہے جن کے ذریعے سے ہرگز نجات نہیں مل سکتی۔ مگر رسہ کر پڑھنے کے بعد میں نے اس کتاب کو واپس کر دیا۔" صفحہ ۲۱

مسلمان: اس کے بعد آپ نے آریہ دھرم کی طرف رُخ کیا تو وہی مایوسی پائی جو دساتیر میں پائی تھی۔ آریوں کی کتاب ستیارتھ پرکاش میں یہ فقرہ دیکھ کر کہ

"ایشور اپنے بھگتوں کے پاپ بھی معاف نہیں کر سکتا"

پادری صاحب کو بہت مایوسی ہوئی۔ چنانچہ اس بارہ میں آپ کے الفاظ یہ ہیں:

"اس کو پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ خدا کی اس سختی پر میرے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ کسی شخص کا نجات کی خاطر آریہ سماجی ہو جانا سراسر عبث اور بے فائدہ ہے کیونکہ آریہ سماجی ہو جانے سے قبل جس قدر گناہ اس سے سرزد ہوئے ہیں۔ خدا ان میں سے ایک بھی معاف نہیں کریگا اور آریہ سماجی ہونے کے بعد بھی جتنے گناہ اس سے سرزد ہونگے۔ اُن کی بھی معافی نہیں۔ پس گناہوں کی سزا پانا ہر دو صورت میں لابدی ہے۔" (صفحہ ۲۲)

آریہ دھرم کے عقائد میں ایک بڑا عقیدہ تناسخ کا بھی ہے۔ پادری صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"تناسخ کا غلط ہونا اس قدر ظاہر ہے کہ اس کے متعلق تحقیقات کرنا اپنے اوقات کو ضائع کرنا اور ناظرین کو دردسر دینا ہے۔ تاہم ڈاکٹر ولسن صاحب کی عبارت کو نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حیوانوں کو انسان کے درجے پر لانے کی کوشش انسان کو حیوانوں کے درجہ تک لے گئی۔ مخلوقات میں جو ٹھیک درجہ انسان کو ملا تھا۔ وہ اس سے چھن گیا اور اس کو ایسا ذلیل کیا کہ حیوانوں۔ پرندوں۔ کیڑے مکوڑوں اور مچھلیوں کے درجہ تک پہنچایا۔ ہاں درختوں اور بوٹوں تک۔

آج میں ایک ذی عقل انسان ہوں۔ کل کو میں ایک چرچڑ کرنے والا بندر ہو جاؤں گا۔ آج تو میں ایک نرم دل عورت ہوں۔ کل کو پھاڑ کھانیوالا بھیڑیا ہوں گا۔ آج میں محنتی لڑکا ہوں۔ کل میں بے وقوف بھینسا ہونگا آج میں کھیلتی کودتی لڑکی ہوں۔ کل چھلانگ مارتی بکری ہونگی۔ یہ کان کھانیوالا کوا شاید میرا متوفی باپ ہوگا۔ یہ کھبو کی بتی شاید میری متوفی ماں ہوگی۔ یہ خرخر کرنیوالا ریچھ شائد میرا بھائی ہوگا۔ اور یہ رینگنے والا سانپ شائد میری بہن ہوگی۔

آریہ سماج میں دائمی نجات نہیں

باوجود اس غلط تعلیم کے میں نے ستیارتھ پرکاش کا مطالعہ بدستور جاری رکھا۔ حتیٰ کہ میں اس عبارت تک پہنچ گیا:

"وہ مکت جیو مکتی پاکر برہم میں آنند کو مہا کلپ کے عرصہ تک بھوگتے ہیں۔ اور پھر مکتی کے سکھ کو چھوڑ کر دنیا میں آتے ہیں۔" (صفحہ ۳۱۶)

اب میرے لئے مطلع بالکل صاف تھا کہ اول تو آریہ سماجی مذہب میں نجات ہے ہی نہیں۔ اور بالفرض محال اگر ہو بھی تو وہ محض چند روزہ اور ناپائیدار ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس چند روزہ نجات میں بھی ہمیں کامل خوشی حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہر وقت یہ اندیشہ رہے گا کہ ہم اب نکالے گئے

اور نکالے گئے۔ پس یہ خیال ہمارے اس چند روزہ عیش کو بھی تلخ کریگا

لہذا آریہ سماجی مذہب میں نجات کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ

بید کے درخت سے پھل کی تمنا رکھنا، مجھ جیسے گنہ گار انسان کے لیئے

ایسی کتاب اور ایسے مذہب کی ضرورت نہیں — یہ کہہ کر ستیارتھ پرکاش کو

بند کر دیا۔ (صـ ۲۳-۲۴)

اس تمہیدی نوٹ کے بعد آپ نے اسلام کا ذکر کیا ہے۔ آپ کو قرآن شریف سے

بھی نجات نہیں ملی۔ کیوں؟ اس لیئے کہ قرآن مجید نے بقول

ع از مکافات عمل غافل مشو ÷ گندم از گندم بروید جو زجو

نیک عمل کرنے کی تاکید کی ہے چنانچہ پادری صاحب کے الفاظ اس بارے میں یہ ہیں:

"قرآن شریف کا مطالعہ کرنے سے جو بات مجھ کو اس سے قبل معلوم تھی

وہی بات اب بھی ثابت ہوئی۔ یعنی یہ کہ نجات کا ملنا صرف اعمال صالحہ

پر موقوف ہے" (صـ ۲۵)

مسلمان اعمال صالحہ کے ذریعہ نجات پانے پر آپ کو تعجب کیوں ہوا؟ اس

کی وجہ پادری صاحب نے بیان کی ہے:-

"میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم سے نیکی ہی نیکی

سرزد ہوتی جائے اور کسی قسم کی بدی ہم سے سرزد نہ ہو۔ کیا انسان میں

ایسی طاقت ہے؟ (صـ ۲۶)

مسلمان بس یہ ہے منشاء غلطی اور مزلت الاقدام جہاں سے پادری صاحب

کو لغزش ہوئی۔ آپ نے سمجھا کہ قرآن شریف میں جو بار بار اعمال صالحہ کی تاکید آئی

ہے اُس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے اعمال نامہ میں نیکی ہی نیکی ہو۔ بدی کا نام ونشان نہ ہو

پس اگر ہم قرآن شریف ہی سے اس عقدہ کو حل کر دیں۔ تو غالباً ہمارے بھائی کی غلطی

رفع ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید کے اتارنے والے عالم الغیب کو علم تھا کہ اعمال صالحہ کی

تاکید پر یہ سوال پیدا ہوگا اس لیئے اس نے پہلے ہی سے اس کا جواب قرآن ہی میں دے

رکھا ہے جو غالباً پادری صاحب کی نظر سے اوجھل رہا۔ لہٰذا وہ غور سے سُنیں۔ ارشاد ہے: اَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ۔ (پ ۳۰۔ ع ۲۶)

"جس شخص کے اعمال میں اکثریت اچھی ہوگی، وہ نجات پا جائیگا۔"

اس ارشادِ الٰہی نے پادری صاحب کے عقدہ کو حل کر دیا۔ لہ الحمد۔

ہمارا خیال ہے کہ جس طرح پادری صاحب کی نظر سے یہ آیت قرآنی اوجھل رہی انجیل کا ایک مقام کبھی انھوں نے نہیں دیکھا۔ دیکھا تو غور نہیں فرمایا۔ ورنہ پادری صاحب اگر اعمال صالحہ سے گھبرا کر اسلام سے برگشتہ ہوئے تھے تو ادھر سے ہٹ کر عیسائی مذہب میں نہ جاتے، کچھ نہ ہوتے تو آزاد ہوتے لیکن مسیحی نہ ہوتے۔ پس پادری صاحب غور سے سُنیں۔ مسیحؑ فرماتے ہیں:

"جو کوئی ان (تورات کے) حکموں میں سے سب سے چھوٹے کو ٹال دیوے اور ویسا ہی آدمیوں کو سکھا دے۔ آسمان کی بادشاہت* میں سے سب سے چھوٹا کہلائیگا۔ پر جو عمل کرے اور سکھلا دے۔ وہی آسمان کی بادشاہت میں بڑا کہلائے گا۔ کیونکہ میں تمھیں کہتا ہوں کہ اگر تمہاری راست بازی فقیہوں اور فریسیوں (علماءِ یہود) سے زیادہ نہ ہو۔ تم آسمان کی بادشاہت میں کسی طرح داخل نہ ہو گے۔" (انجیل متی باب ۵ فقرات $\frac{19}{20}$)

مسلمان اللہ اللہ نیک اعمال کرنے کی کس قدر تاکید شدید ہے جن میں نہ اکثریت کا لحاظ ہو نہ اقلیت کی معافی بلکہ مقابلہ کا سخت امتحان ہو۔ فیصدی صد نمبر پانے کی ضرورت نہیں[1]

مسیحی دوستو! اعمال صالحہ کی وجہ سے اسلام چھوڑ کر مسیحی ہونے والے پر یہ عربی مثال صادق آتی ہے یا نہیں؟ فَرَّ مِنَ الْمَطَرِ قَامَ تَحْتَ الْمِیْزَابِ[عه]

---

[1] پادری صاحب نے اس موقعہ پر راست گوئی سے کام لیتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ لکھتے ہیں: "اس میں کوئی شک نہیں کہ اناجیل میں اعمال صالحہ پر بیحد تاکید ہے۔ یہاں تک کہ قرآن شریف کی تاکید اس کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے لیکن قرآن شریف کی تاکید میں اور اناجیل (باقی بر صفحہ ۵۶)

[عه] بارش سے بھاگ کر پرنالہ کے نیچے کھڑا ہوا۔ * انجیل کے محاورے میں نجات کو آسمانی بادشاہت کہا گیا ہے۔

پادری صاحب نے ایک حدیث[۲] نقل کی ہے جس میں ذکر ہے کہ حضرت آدم جو بھولے
ن کی ساری اولاد بھولنے لگی۔ اس حدیث سے آپ نے نتیجہ نکالا ہے:

---

۵ پادری صاحب نے جواب الجواب میں اس مقام پر (چراغ داشتہ) کمال جرأت سے
کام لیا ہے جس سے میرا سارا حُسنِ ظن جو آپ سے اور آپ کے مداح خوانوں سے تھا۔
سب کافور ہو گیا۔ پادری صاحب لکھتے ہیں:
آپ (مولوی ثناء اللہ) لکھتے ہیں کہ پادری صاحب نے ایک حدیث نقل کی ہو وہ
حدیث کہاں ہو۔ شاید مولوی صاحب کے پیٹ میں۔ اگر آپ درحقیقت شیر قالین نہیں تو
آپ نے اس حدیث کو بجنسہٖ نقل کیوں نہیں کیا؟ آپ کی دیانت داری کا یہ ایک ادنیٰ
نمونہ ہے کہ بندگانِ خدا کو دھوکہ میں ڈال کر ان کو یہ یقین دلا رہے ہیں کہ پادری صاحب
نے ایک حدیث نقل کی ہو کہ آدم جو بھولے اُن کی ساری اولاد بھولنے لگی حالانکہ
جس حدیث کو میں نے نقل کیا ہے نہ تو اس کی عربی میں لفظ "بھولنا" ہے اور نہ ہی
اس کے ترجمہ میں۔ جس حدیث کو ہم نے نقل کیا ہو اس میں تین لفظ قابلِ غور آتے ہیں۔
یعنی (۱) جحد (۲) نسی (۳) خطا۔ مولوی صاحب نے ان تینوں لفظوں میں سے صرف
لفظ "نسی" کو لے لیا ہے اور اس کا غلط ترجمہ کر کے اپنے ہمنیالوں کو یہ یقین دلایا ہے
کہ بس پادری سلطان محمدؐ کا جواب ہو چکا۔ حالانکہ لفظ "نسی" کے معنی بھولنے کے نہیں
ہیں بلکہ ترک کرنے کے ہیں۔" ("شیر افگن" صہ ۳۴)

اب دل نہیں چاہتا کہ جواب دیا جائے کیونکہ ابھی اتنا گمان ہو کہ آپ کے
ں کے پاس آپ کا رسالہ "میں مسیحی کیوں ہوا" ہوگا۔ وہ اس کے صہ ۲۵ کی سطر
حدیث دیکھ لیں گے جس کی بابت آپ نے میرے حق میں مکروہ الفاظ لکھے ہیں۔ پھر
لحہ کے حاشیہ کی سطر ۱۳ میں آپ نے اس حدیث کے اُن الفاظ کا جن پر مدارِ
تدلال ہے یوں ترجمہ کیا ہے:
اور آدم کی نسیان سے جو شجرہ ممنوعہ میں سے کھایا اُس کی اولاد بھی ناسی
ہوئی۔ (رسالہ "میں کیوں مسیحی ہوا" حاشیہ صہ ۲۸ سطر ۱۳) باقی اگلے صفحہ پر)

"اس حدیث سے اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ درحقیقت کل بنی آدم گنہ گار ہیں کیونکہ گناہ نے سب میں نفوذ کیا۔" (ص ۲۸)

حیرانی ہے کہ پادری صاحب کس کوشش میں ہیں اور اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہیں۔ حدیث میں نسیان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے کہ انسان میں فطرتاً نسیان (بھولنا) داخل ہے۔ عدم نسیان صرف خدا کا خاصہ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا (پ ۱۶، ع ۷)

(تمہارا پروردگار نہیں بھولتا)

اسی لئے فلسفیانہ مثل ہے۔ "الانسان مرکب الخطاء والنسیان" اس کو گناہ سے کیا تعلق؟ کیا آپ کو یاد نہیں کہ اسلامی اصول کے موافق روزہ دار نسیان میں کھائی لے تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ نماز میں سہو ہو جائے تو نماز نہیں ٹوٹتی۔ ثابت ہوا کہ نسیان مستلزم گناہ نہیں۔ فاندفع ماتوھم۔

علاوہ اس کے ہم مانے لیتے ہیں کہ سب بنی آدم گناہگار ہیں۔ پھر کیا اس سے ثابت ہوا کہ اسلام میں نجات نہیں۔ اس وہم کا مداوا خدا نے کیا ہی اچھا فرمایا:

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (پ ۲۴ ع ۳)

(خدا کی رحمت سے بے امید نہ ہو خدا سب گناہ معاف کر دے گا)

دوسرا طریق نجات اسلام میں ایک طریقہ نجات تو اکثریت اعمال صالحہ دوسرا اکثریت اجتناب از معاصی ہے یعنی جو شخص اکثر حالات میں بڑے بڑے گناہوں سے بچتا رہے گا وہ نجات پاجائے گا۔ ملاحظہ ہو:

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ (پ ۲۷ ع ۷)

(بقیہ حاشیہ از ص ۴۹) کیوں جناب پادری صاحب! یہ نسیان اور ناسی کس لفظ کا ترجمہ

ناظرین کرام! جس مصنف کو نسیان کے معنے میں بھی نسیان ہو سارے پڑھے پڑھائے اس کو فقدان ہو جائے تو کیا تعجب ہے۔ افسوس یہ سارے کرشمے باطل پسندی کے ہیں

"یعنی جو لوگ بڑے بڑے گناہوں (شرک۔ کفر۔ چوری وغیرہ) اور فواحش (زنا۔ لواطت وغیرہ ہمچو قسم) سے بچتے ہیں۔ مگر معمولی غلطیاں اُن سے ہو جاتی ہیں۔ خدا انکے حق میں بخشنہار بڑی بخشش والا ہے۔ یعنی انکی بخشش ہو کر نجات ہو جائیگی۔"

پادری صاحب! غور فرمایئے کیسی پاکیزہ موافق فطرت تعلیم ہے۔ انسان بقول آپ کے اگر فطرتاً گنہگار بھی ہے تو اس کا علاج یہی ہے کہ وہ اپنے فطری گناہوں کی بابت احتیاط سے کرتا رہے تاکہ خدا کی رحمت اس کی دستگیری کرے۔

دوسرا طریقہ بالکل آسان اور پادری صاحب کے حسب منشا ہے کہ طالب نجات انسان روزانہ اپنے گناہوں پر غور کر کے خدا کے حضور خالص توبہ کیا کرے تو خدا اس کی توبہ قبول کر کے بخشدیگا۔ خدا خود فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ (پ ۲۵ ع)

"خدا ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔"

مختصر یہ ہے کہ اسلام طالب نجات کو مایوس نہیں کرتا، بلکہ بزبانِ حال کہتا ہے

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ	گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست	صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

پادری صاحب نے اپنے رسالہ میں دعوے کیا ہے کہ اسلام میں نجات نہیں اس دعوے کے ثبوت میں علاوہ گذشتہ حوالجات کے ایک حوالہ آیت مندرجہ ذیل کا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

إِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا وَّنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ۝ (پ ۱۶ ع ۸)

"یعنی ہر ایک تم میں کا جہنم میں ضرور وارد ہوگا۔ پھر ہم پرہیزگاروں کو نکال لینگے۔ اور ظالموں کو اسی جہنم میں اوندھا چھوڑ دیں گے۔"

اس آیت پر پادری صاحب کو خاص توجہ ہے اور اسی سے ان کو صدمہ ہوا ہے جس کا ذکر اُنہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

"اس آیت کے پڑھنے سے جسقدر خوف۔ دہشت اور مایوسی مجھ پر طاری ہوئی مَیں ہی جانتا ہوں اور میرا دل جانتا ہے۔ اگر کسی بیمار شخص کو کوئی ڈاکٹر یا حکیم یہ کہدے کہ مَیں تجھ کو اچھا کرنے کے بجائے مار ڈالونگا۔ کیونکہ میرا فرض ہے تو اس کمبخت بیمار پر جو کچھ اس کے کہنے کا اثر ہوگا۔ اس سے بھی بدرجہا زیادہ اثر مجھ پر ہوا کیونکہ میں ایک روحانی بیمار تھا۔ مَیں قرآن شریف کو اس نیت سے پڑھتا تھا کہ وہ ایک روحانی ڈاکٹر کی حیثیت سے میری معصیت کا علاج بتائیگا لیکن بجائے علاج بتلانے کے مجھ کو صاف صاف سنایا کہ تم میں سے ہر ایک شخص جہنم میں جائیگا کیونکہ تیرے رب پر یہ قطعی فرض ہو چکا ہے۔" (رسالہ مَیں کیوں مسیحی ہوا) صـ۳۱

مسلمان سچ تو یہ ہے جس قدر پادری صاحب کو اس آیت سے مایوسی کا صدمہ ہوا ہے، ہمیں اپنے عزیز کی غلط فہمی میں جدائی کا اس سے زیادہ صدمہ ہے اس لئے ہم کوشش کرتے ہیں کہ آپ کی غلط فہمی دُور ہو جائے۔ (خدا وہ دن کرے) آیت موصوفہ میں صرف ایک لفظ تحقیق طلب ہے یعنی وَارِدُ۔ یہ لفظ اسی صورت (اسم فاعل) میں سورۂ یوسف میں آیا ہے۔

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ (پ۱۲ ع۱۲)

"یعنی جب مسافروں کا قافلہ آیا تو انھوں نے اپنا وارد بھیجا (تاکہ پانی لاوے) اس نے اپنا ڈول کنوئیں میں ڈالا۔"

یہی لفظ سورۂ قصص میں بصیغہ ماضی آیا ہے۔ غور سے سنیئے!

وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ (پ۱ ع۶)

"حضرت موسیٰ مدین کے پانی کے پاس آئے تو وہاں دیکھا کہ ایک قوم پانی پلاتی ہے۔"

ان دونوں موقعوں پر اس لفظ سے پانی کے اندر گھسنا مُراد نہیں ورنہ اس کے بعد اَدْلَىٰ دَلْوَهُ اور وَجَدَ عَلَيْهِ صحیح نہ ہوگا۔ پس وارد کے معنی ہیں "پانی کے پاس پہنچنے والا" ان دونوں شہادتوں سے آیت زیر بحث کے معنے یہ ہوئے کہ

لہ پادری صاحب نے وَرَدَ یرِدُ کی تعلیل تو بتائی جس کی ضرورت نہ تھی مگر قرآنی لفظ کیلئے قرآنی منشا معلوم نہ کیا۔ ۱۲

ہر ایک ابنِ آدم نیک ہو یا نہ، نارِ جہنم کے پاس سے گذریگا جس کی بابت حدیثوں میں اوپر لفظ آیا ہے نہ کہ اندر۔ پھر وہ اپنے اپنے اعمال کے موافق جہنم سے دُور ہٹتے جائیں گے اور ظالم بدکردار لوگ جو جہنم ہی کے لائق ہوں گے جہنم میں چھوڑ دیئے جائیں گے۔ یہی معنی اس حدیث کے ہیں جو پادری صاحب نے اپنی غلط فہمی کی تائید میں نقل کی ہے۔ حالانکہ وہ ہماری تائید ہے جس کی نسبت پادری صاحب کے الفاظ ہیں:

آیت بالا کی تفسیر خود آنحضرتؐ کی زبانی

لیکن جو محبت اور الفت خود محمدؐ کو اسلام کے ساتھ تھی اس نے مجھ کو ذاتی فیصلہ کرنے اور عجلت سے کام لینے سے روک دیا اور میں نے مناسب سمجھا کہ احادیث میں اس آیت کی تفسیر تلاش کروں اور دیکھوں کہ خود آنحضرتؐ اس کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ چنانچہ تلاش کرتے کرتے مجھ کو ذیل کی حدیث مشکوٰۃ میں مل گئی۔

وعن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرد الناس النار ثم یصدرون منہا باعمالہم فاولہم کلمح البرق ثم کالریح ثم کحضر الفرس ثم کالراکب فی رحلہ ثم کشد الرجل ثم کمشیہ

(ترجمہ) ابن مسعود کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ سب لوگ دوزخ میں داخل ہونگے۔ پھر اپنے اعمال کے بموجب اس سے نکلیں گے۔ ان کے اول بجلی کی چمک کی طرح جلدی نکلینگے پھر ہوا کی طرح، پھر گھوڑے کی دوڑ کی طرح۔ پھر سوار کی طرح۔ پھر انسان کے پا پیادہ چلنے کی طرح۔ اس حدیث کو ترمذی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

(مشکوٰۃ کتاب الفتن فی الحوض والشفاعۃ صہ ۴۹۴ مطبوعہ مجتبائی دہلی)

اب آیت بالا کا مطلع صاف ہو گیا کہ کل افراد انسان کا ایک دفعہ جہنم میں جانا لابدی ہے۔ پھر اپنے اپنے اعمال کے بموجب اس سے نکلتے رہیں گے (اصہ ۳۱/۳۲)

مختصر یہ ہے کہ لفظ وارد کے معنی سمجھنے میں آپ کو غلطی ہوئی ہے۔ ہم اس کا

ترجمہ کرتے ہیں۔ "پاس پہنچنے والا" پاس سے گذرنے والا"۔ آپ کرتے ہیں آگ میں داخل ہونے والا۔ ہمارے ترجمہ کی شہادت خود قرآن دیتا ہے۔ ہمیں یہی کافی ہے ؎

گدایاں را ازیں معنے خبر نیست   کہ سلطان جہان با ماست امروز

بقیہ حاشیہ از صفحہ ۵۔

کی تاکید میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قرآن شریف کی تاکید کے معنی خدا کے ساتھ تجارت کرنا ہے۔ اناجیل کی تاکید کے یہ معنے ہیں کہ ہر ایک حالت میں خدا کی عبادت کرنی لازمی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کو عبادت کی اُجرت میں جنت ملے یا عبادت نہ کرنے کی سزا میں دوزخ ملے۔ ہم خدا کے فرزند ہیں۔ سعادت مند فرزندوں کا فرض ہے کہ اپنے باپ کے فرمانبردار اور مطیع رہیں خواہ ان کا باپ ان کو انعام دے یا نہ دے۔ غرضیکہ مسیحیوں کے اعمال صالحہ میں خوف اور رجا کو مطلق دخل نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ اناجیل میں ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جو اس پر دلالت کرے کہ نجات اعمال صالحہ پر موقوف ہے۔" (رسالہ شیر افگن صفحہ ۳۷/۳۸)

ناظرین! مطلع صاف ہے۔ قرآن مجید اور انجیل دونوں اعمالِ صالحہ کی تاکید کرتے ہیں۔ اب پادری صاحب کا ہم سے یہ تقاضا ہے کہ انجیل سے ہم یہ دکھائیں کہ: "نجات اعمال صالحہ پر موقوف ہے۔"

ہمیں اس تقاضا سے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ انجیل میں ایسا حوالہ ملنے سے پادری صاحب واپس اسلام میں آجائینگے ورنہ کہا جائیگا

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ

پس سنیئے! مسیح فرماتے ہیں:

"اگر تو (سلطان محمد) زندگی میں داخل ہونا چاہے تو حکموں پر عمل کر۔" (متی ۱۹/۱۷)

ناظرین کرام! اعمال صالحہ کی کیسی صاف تاکید ہے۔ نہ صرف تاکید ہے بلکہ اعمال صالحہ پر نجات کا توقف ہے۔ (باقی حاشیہ بصفحہ آئندہ)

میرے عزیز برادر! قرآن مجید اور حدیث شریف کی تشریح تو ہم نے بشہادتِ قرآن آپ کو بتادی۔ اب ذرہ آپ بھی اپنے اُس مذہب کے (جس کی طرف آپ گئے ہیں) ایک مقام کی تشریح ہم کو سنائیے۔ یاد نہ ہو تو سنیئے!

حاشیہ بقیہ از صفحہ ۵۶

پادری صاحب نے قرآنی اور انجیلی تاکیدی احکام میں جو فرق بتایا ہے وہ مسیح کے اس ارشاد سے غلط ہوگیا۔ ہم نے مسیح کا ارشاد اور آپ کا قول دونوں ناظرین کے سامنے بالمقابل رکھ دیئے ہیں۔ مسیح صاف فرماتے ہیں:

"زندگی میں داخل ہونا چاہے تو حکموں پر عمل کر۔"

زندگی سے مراد یہاں دنیاوی زندگی یا دنیاوی سوسائٹی نہیں، بلکہ اُخروی زندگی ہے جس کو انبیاء کی اصطلاح میں "نجات کہا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں بھی اسی اصطلاح پہ ارشاد ہے:

اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ۔ (پ ۲۰۔ ع ۱۲)

(آخرت کا گھر ہی اصل زندگی کا گھر ہے۔)

بس انجیل اور قرآن دونوں متفق ہیں۔ البتہ مولوی اور پادری مختلف۔ پس

پادری صاحب!

جنگ کردی آشتی کن زانکہ نزدِ عاقلاں

ایں مثل مشہور "اوّل جنگ آخر آشتی"

ہاں جناب! آپ نے بہ خوب فرمایا کہ:

"اناجیل میں اعمال صالحہ پر اس لئے تاکید کی ہے کہ اعمال صالحہ ایمان یعنی مسیحی کی خاص علامت اور راستبازی کا نشان ہے۔" (شیر افگن صفحہ ۳۹)

بہت خوب! یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کا بھی جابجا ارشاد ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو: اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (باقی صفحہ ۵۹ پر)

مسیح فرماتے ہیں:

"ہر ایک شخص آگ سے نمکین کیا جائے گا!"

(انجیل مرقس باب ۹ فقرہ ۹ ۴نم)

بتایئے! ہر شخص میں آپ تو نہیں ہوں گے؟ اور نمکین ہوتے وقت آگ بدن مبارک کو تو نہ لگے گی؟

پادری صاحب! آیت اور حدیث میں تو استثناء ہے یعنی نیک اعمال کرنے والے لوگ اپنے اپنے اعمال کے موافق دوزخ سے نکل جائینگے۔ جس کی تشریح ہم نے کر دی ہے انجیل میں تو استثناء بھی نہیں۔

آہ! کیسا بھیانک سماں ہو گا کہ

"ہر ایک آدمی آگ سے نمکین کیا جائے گا"

پادری صاحب! اس پر بھی آپ قرآن چھوڑ کر انجیل کی پناہ میں رہینگے تو میں بجز اس کے کیا کہوں گا ؎

میرے پہلو سے گیا پالا ستمگر سے پڑا ۔۔۔ مل گئی اے دل تجھے کفران نعمت کی سزا

حاشیہ بقیہ از صفحہ ۵۷ متعلقہ صفحہ ۵۶

پادری صاحب! ہم آپ کے شکر گذار ہیں کہ آپ نے مسیحیوں کے ایمان کے لئے اعمال صالحہ کو نشان قرار دیا جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ

"آجکل بے عمل عیسائی ایمان سے خالی ہیں۔ جب ایمان سے خالی ہیں تو مسیح کا کفارہ بھی اُن کے حق میں بے کار چیز ہے"۔

ناظرین کرام! پادری صاحب کی کمال بلاغت ملاحظہ ہو کہ مسیحی مذہب کو کس طرح چکنا چور کرتے جاتے ہیں۔ ہم مسلمان انکے مشکور ہیں اور دعا دیتے ہیں کہ خدا آپ کو اس کفر شکنی کا نیک بدلہ دے؟ ؎

"ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"

سلہ پادری صاحب کو اپنی بات کی اتنی پچ ہے کہ خواہ مخواہ قرآن مجید کا مطلب بگاڑنے پر تلے بیٹھے ہیں آپ نے موقع بموقع پر چند حوالے نقل کئے ہیں جن سے بخیال خویش (باقی صفحہ ۵۹ پر)

پادری سلطان محمدؐ صاحب کو آیت قرآنی لَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً پر بھی بہت مشکل پیش آئی۔ ہماری دعا ہے خدا آپ کی یہ مشکل آسان کرے۔ آپ لکھتے ہیں:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ۔ (سورہ ہود)

"اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک امت بناتا لیکن یہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔ مگر جس پر تیرے رب کا رحم ہو۔ اور خدا نے ان کو اسی لئے پیدا کیا ہے تاکہ تیرے رب کی یہ بات پوری ہو کہ میں جنوں اور آدمیوں سے دوزخ بھر دوں گا۔"

بقیہ حاشیہ از صفحہ ۵۸

ثابت کرنا چاہا ہے کہ وارد کے معنے میں دخول ضرور ہے۔ ہم اس مقام پر ایک مسلمہ امام لغت کا حوالہ دیتے ہیں جس نے خاص قرآن مجید کی لغات کمال تحقیق سے لکھی ہیں۔

علامہ راغب اس لفظ کے متعلق لکھتے ہیں:

الا واردها فقد قيل منه وردت ماء كذا اذا احضرته وان لم تشرع فيه (مفردات راغب)

یعنی الا واردها جو قرآن میں آیا ہے۔ بعض اہل لغت نے کہا ہے۔ اس محاورے سے ہے جب کوئی پانی کے پاس پہنچتا ہے کہتا ہے وَرَدْتُ ماءً میں پانی پر وارد ہوا۔ چاہے اس کے اندر نہ گیا ہو۔

پادری صاحب! آیئے ہم آپ کی مزید تشفی کے لئے ایک تمثیل سناتے ہیں۔ جیل میں داخل ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) دیوار کے اندر جو بھی ہے اس کو جیل کے اندر کہتے ہیں چاہے قیدی ہو یا ملاقاتی۔ (۲) دوسرے معنی میں جیل کی تکلیف میں مبتلا ہونا جو مجرموں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ پس آیت کے معنی یہ ہیں

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

اس آیت کو پڑھ کر جو صدمہ میرے دل کو پہنچا اس سے میں یہانتک متاثر ہو گیا کہ قرآن شریف کو آہستہ سے بند کر دیا اور اسی جگہ سر رکھ کر تفکرات میں مستغرق ہو گیا۔ خواب میں بھی چین نہ ملا کیونکہ بیداری کے خیالات نیند میں مجسم ہو کر چھیڑ رہے تھے۔ میرا دل بہت ہی مضطرب اور سیماب کی طرح بیقرار تھا۔ لیکن اسلام کا ترک کرنا میرے لئے از بس مشکل تھا جان دینا مجھ کو منظور تھا لیکن اسلام کا چھوڑنا نا منظور

حاشیہ بقیہ از ص ۵۹

کہ ہر ایک شخص دوزخ میں داخل ہوگا جیسے جیل میں جاتے ہیں۔ چاہے مجرم ہوں یا غیر مجرم۔ داخل ہو کر نیک لوگ اس سے عبور کر جائیں گے اور بدکار اس کے عذاب میں پھنسکر رہ جائیں گے۔ غور سے پڑھئے!

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا (پ ١٦ ع ٨)

(داخلہ جہنم کے بعد ہم پرہیزگاروں کو عبور کرا دیں گے اور ظالموں کو وہیں چھوڑ دینگے) یہی تفسیر حدیث میں آئی ہے کہ بدکار لوگ دوزخ کے اندر گرفتار کئے جائینگے۔ کہیئے کیا رائے ہے؟

پادری صاحب! آیت کے معنے تو ہم نے بتا دیئے، مگر آپ نے اپنے حوالے سے کیوں خاموشی کی نظر سامی سے نہ گذرا ہو تو پھر سنیئے!

"ہر ایک آدمی آگ سے نمکین کیا جائے گا" (انجیل مرقس باب ۹ فقرہ ۴۹)

اسی ذیل میں پادری صاحب نے کھسیانے ہو کر وہ حدیث بھی لکھدی ہے جس کا ترجمہ انھوں نے یوں کیا ہے:-

"پروردگار دوزخ میں اپنا قدم رکھے گا۔ (تنبیر انگن ص ۱۸۱)

اس حدیث کا صحیح ترجمہ بتانے کو ہم بھی امام لغت "صاحب القاموس" کا قول نقل کر دیتے ہیں

وفی الحدیث حتی یضع رب العزۃ فیھا قدمہ ای الذین قدمھم من الاشرار فھم قدم اللّٰہ للنار کما ان الاخیار (باقی ص ٦١ پر)

لہذا کچھ عرصہ تک سوچتا رہا اور اس جستجو میں رہا کہ اگر کوئی بھی حیلہ یا سہارا مجھ کو مل جائے تو میں اسلام کو ہرگز نہیں چھوڑونگا۔ اسی نیت سے احادیث کا سہارا ڈھونڈنے لگا کہ ممکن ہے اس طرف سے کوئی بہانہ مل جائے اور اسلام کو ترک نہ کرنا پڑے۔" (صـ۲۲ رسالہ "میں کیوں مسیحی ہوا")

قدم اللہ الی الجنۃ (قاموس)

"یعنی قدم اللہ کے معنی وہ لوگ ہیں جن کو دوزخ کے لئے یا بالفاظ دیگر دوزخ جن کے لئے طیار کی گئی ہے۔"

لغات حدیث کی معتبر کتاب "مجمع البحار" میں بھی یہ معنی لکھے ہیں کہئیے کیا سوال ہے

پادری صاحب سنیئے! بقول ایک مسیح بے خبر مسلمان علماء میں علم و فضل کے لحاظ سے آپ (پادری پال) کے رتبہ کا کوئی نہیں۔ آپ حافظ قرآن ہیں۔ حافظ حدیث ہیں اور خدا جانے کیا کیا ہیں۔ تاہم ہم آپ کو ایک اصول کلام بتاتے ہیں۔ آپ قبول کریں گے تو فائدہ اٹھائیں گے۔

کسی کلام کی توجیہ کرنے کے لئے امکان صحت کافی ہوتا ہے۔ اس لئے امکان صحت کے ہوتے ہوئے تغلیط پر زور دینا علم بلاغت کے خلاف ہے۔ مثلاً کوئی شخص کہتا ہے۔

زمانہ کی گردش سے ہے کس کو چارا کبھی یاں ہے بہمن کبھی یاں ہے دارا

امکان ہے کہ اس کلام کا متکلم خدا کا قائل ہو اور زمانہ کی طرف نسبت مجازی کرتا ہو۔ اس لئے ایسے قائل کو دہریہ ثابت کرنے پر زور دینا جائز نہیں بلکہ نسبت مجازی کہہ کر کلام کو صحیح کہدینا چاہیئے۔

اسی طرح قرآن ہو یا انجیل، وید ہو یا تورات جہاں تک کلام کی صحت کا امکان

لہ عیسائی اخبار "نور افشاں" مورخہ یکم مئی ۱۹۲۹ء صـ۴

اہلحدیث اس مشکل کی وجہ آپ نے نہیں بتائی۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کیا مشکل پیش آئی تھی۔ شاید آیت کو نہ سمجھنے سے مشکل پیدا ہوئی ہو، اس لئے ہم

حاشیہ بقیہ از صا٦

ہو اُس کو صحیح پہلو میں رکھنا اصول کلام ہے۔ آپ اس علمی نکتہ اور منصفانہ اصول کو قبول کریں گے تو فائدہ اٹھائیں گے۔ ورنہ ما بخیر شما بسلامت۔

پس قرآن کی آیات اور احادیث جتنی بھی آپ پیش کرینگے اُن کی لغوی تحقیق میں اگر متعدد معنے ثابت ہوں گے تو اُن میں سے وہی معنے معتبر کئے جائیں گے، جو اصولِ شریعت کے موافق ہونگے۔ (فتنبہ)

پادری صاحب نے کمال کیا۔ جب دیکھا کہ اصل ترجمہ قرآن سے کام نہیں چلتا تو اپنا مصنوعی ترجمہ کر دیا۔ آیتِ ذیل ملاحظہ ہو:

وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا۔ (مریم)

اس آیت کا ترجمہ جو پادری صاحب نے کیا ہے قابلِ داد ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"ہانک لیجائینگے گناہگاروں کو دوزخ کی طرف داخل ہونے کے لیے۔" (شیر افگن ص۱۱)

یہ ترجمہ نہ صرف غلط ہے بلکہ آپ کی لیاقت اور دیانت دونوں پر پانی پھیرتا ہے۔

سنئیے! اس ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "داخل ہونے کے لئے" مفعول لہٗ ہے نسوق سے، حالانکہ مفعول لہ کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ اسی فاعل کا فعل ہو جو اس سے معلل ہے۔ کافیہ کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"وشرط نصبه تقدیر اللام وانما یجوز حذفها اذا کان فعلا لفاعل الفعل المعلل به۔"

اس عبارت کا مطلب ادنےٰ سے ادنےٰ طالب علم بھی جان سکتا ہے کہ مفعول لہ در اصل فاعل کا فعل ہوتا ہے جس کا یہ مفعول بہ ہو جیسے ضربت تادیبا۔

مگر پادری صاحب نے غضب کیا کہ نَسُوْقُ کا مفعول لہ "داخل ہونے کو" بنا دیا۔ (باقی ص۶۳ پر)

اس آیت کی تفسیر کر دیتے ہیں ممکن ہے صحیح تفسیر ہی سے آپ کی مشکل حل ہو جائے۔
اس میں کیا شک ہے کہ دنیا میں اختلاف رائے، نہ صرف دینی کاموں میں بلکہ

حاشیہ بقیہ از ص۶۲

(گویا) بقول پادری صاحب کے خدا خود کہتا ہے کہ (جل جلالہ)
"ہم مجرموں کو اس لئے دوزخ کی طرف لے جائیں گے کہ خود دوزخ میں داخل ہوں"
کاش آپ اپنے پیشرو پادری عماد الدین متوفی کا ترجمہ ہی نقل کر دیتے جو فنِ ارتداد میں آپ کا پیشرو تھا۔ سنیئے! پادری صاحب موصوف لکھتے ہیں:
"مجرموں کو دوزخ کی طرف پیاسا ہانکیں گے"
حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی یہی فرمایا ہے۔ مگر آپ نے اپنی عربی دانی کا کمال دکھانے کو سب مترجمین کے خلاف نیا ترجمہ کیا جس سے آپ کے مداحوں کی ہمہ خوانی کا پول کھل گیا جو کہتے ہیں:
"مسلمانوں میں پادری بال صاحب کے پلہ کا ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے گا"
(نور افشان یکم مئی ۱۹۲۹ء)
سچ تو یہ ہے کہ یہ صاحب آپ کو اتنا نہ چڑھاتے تو ہم بھی آپ کی ایسی غلطی سے چشم پوشی کر جاتے۔ جو کچھ لکھا ہے انہیں آپ کے نادان دوستوں نے لکھایا ہے جن کے حق میں استاد صاحب کہہ گئے ہیں ؎

صائب دو چیز مے شکند قدر شعر تعریفِ ناشناس و سکوتِ قدر شناس

پادری صاحب نے ایک حدیث بھی لکھی ہے جس میں یہ لفظ ہیں:
"یرد الناس النار ثم یصدرون منها باعمالهم"
"یعنی لوگ جہنم میں داخل ہونگے اپنے اعمال کے بموجب اُس سے نکلینگے" (تنبیر انگن ص۳۷)
ہم اسی رسالہ میں بتا چکے ہیں کہ جہنم میں داخلہ دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک مجرم کا دوسرا عام لوگوں کا۔ یہاں جو ورود ہے وہ دوسری قسم کا ہے جس میں عذاب لازم نہیں۔

دنیاوی امور میں بھی۔ نہ صرف بیرونی کاموں میں بلکہ خاندانی امور میں بھی۔ اس اختلاف کا مبنی دراصل اختلاف فہم ہے جو قدرتی اصول پر مبنی ہے۔ اس قدرتی اختلاف کو ملحوظ رکھ کر قرآن مجید کی آیت مذکورہ میں بتایا گیا ہے کہ باوجود ان اختلافات کے خدا کو قدرت ہے کہ اگر چاہتا تو ان سب لوگوں کو متحد الخیال بنا دیتا۔ (لاریب فیہ) اس کے بعد فرمایا انسانی افراد اپنے خیالات میں ہمیشہ مختلف رہیں گے۔ اور ان کو اسی اختلاف پر پیدا کیا ہے۔ مگر جن لوگوں کے تلاشِ حق کرنے کی وجہ سے اُن پر خدا کی نظر عنایت ہو گی وہ اس اختلاف سے الگ رہ کر سیدھی راہ پر چلیں گے۔ اور جو ٹیڑھے چلیں گے خدا اُن سے جہنم کو بھریگا۔ یہ ہے اس آیت کی صحیح تفسیر۔ پادری صاحب اس پر اعتراض کرینگے تو اُن کو جواب دیا جائے گا۔ مگر اعتراض کرنے سے پہلے بائبل کے ایسے مقامات بھی دیکھ لیں جہاں سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں کہنا پڑے؎

انھوں نے خوبرو شکلیں کبھی دیکھی نہیں شاید
وہ جب آئینہ دیکھیں گے تو ہم اُن کو بتا دینگے

لہ پادری صاحب نے اس مقام پر ایک ایسا اعتراض کیا ہے جس سے نامہ نگار نورافشان (مندرجہ صلا ۶۳) کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں آپ جیسا ناقص العلم کوئی نہ ہو گا۔ پادری صاحب لکھتے ہیں:

"آپ (ثناء اللہ) کسی مدرسہ کے ادنیٰ طالب علم سے جا کر پوچھ لیجئے کہ لاملئن میں لام اور نون کے کیا معنے ہیں اور نیز یہ پوچھئے کہ ناس جمع ہے یا واحد۔ اور پھر یہ پوچھ لیجئے کہ ناس پر الف لام کے کیا معنی ہیں۔ اور یہ پوچھ لیجئے کہ اجمعین کس لئے آیا ہے تو وہ طالب علم آپ کو بتلادیگا کہ لاملئن میں لام تاکید یا نون تاکید ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "ضرور بالضرور میں بھر دونگا"۔ اور ناس کے متعلق یہ بتلادیگا کہ یہ جمع ہے یعنی تمام اصناف انسانی اور الف لام (باقی صلا ۶۵ پر)

پادری سلطان محمدؐ صاحب قرآن مجید سے فرصت پاکر احادیث کی طرف متوجہ ہوئے - سچ تو یہ ہے جس کو قرآن مجید میں نجات نہ ملی وہ احادیث شریفہ سے کیا لے سکتا ہے - لطف یہ ہے کہ احادیث کے ساتھ بھی آپ نے سوتیلی ماں کا سا برتاؤ کیا جس کی غرض ہی یہ ہو کہ بچے کا حسن نمایاں نہ ہونے پائے - اسی طرح پادری صاحب نے قرآن وحدیث کے ساتھ عمل کیا - آپ نے دل میں یہ جمالیا کہ قرآن اور حدیث سے

حاشیہ بقیہ از صـ۶۴

کے متعلق یہ بتلادیگا کہ الف لام استغراق ہے جو تمام افراد انسانی پر حاوی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "تمام افراد انسانی" اجمعین کی بابت یہ بتلادیگا کہ یہ تاکید معنوی ہے یعنی سب کے سب - پس اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ میں ضرور بضرور سب کے سب تمام افراد انسانی سے دوزخ کو بھردوں گا - اب ایک سوال اور آپ سے کر کے اس حصہ کو ختم کرتا ہوں - وہ یہ کہ آخر آپ بھی تو افراد انسانی میں شامل ہیں - آپ کدھر جانا چاہتے ہیں - دوزخ کی طرف یا جنت کی طرف - ہماری تو یہی دعا ہے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ جنت میں ہوں" (شیر افگن صـ۲۳)

طلبا مدارس عربیہ - غور کریں کہ پادری صاحب (ہاں بنظیر عربی کے عالم) نے اس اقتباس میں دعوے کئے ہیں (۱) ناس جمع ہے - (۲) الف لام استغراق ہے - (۳) اجمعین تاکید معنوی ہے -

اے جناب اے عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

(۱-۲) ناس جمع ہے الف لام استغراق ہے تو اس کا ترجمہ کیا ہوگا -

اِذْ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ (پ۴ ع ۹)

"تمام اصحاب کرام کو تمام ناس (سب لوگوں) نے کہا کہ تمام ناس (سب لوگ) تمہارے برخلاف جمع ہیں - پس اُن سے ڈر جاؤ" (باقی بر صـ۶۶)

نجات کا ثبوت نہ ہونے دوں - بس پھر کیا تھا - جس جگہ اعمال سے نجات ملنے کا ذکر آیا اس کو تو یوں ٹال دیا کہ اعمال کون کرے - اور جہاں کلمہ شہادت پڑھنے سے نجات کا وعدہ ہو وہاں آپ کو اور ہی شبہات سوجھے - چنانچہ آپ کے

حاشیہ بقیہ از ص ٦٥

کیا کبھی ایسا ہوا بھی کہ ساری دنیا کے لوگ اصحابؓ کے برخلاف جمع ہوں اور ساری دنیا کے سب لوگوں نے ایسا کہا ہو: ایں چہ بوالعجبی است

(۳) تاکید معنوی کی بابت تو علماء نحو کی تصریحات ہیں کہ وہ نفس اور عین کے ساتھ ہوتی ہے - جیسے جاء زید نفسہ او عینہ (کافیہ فافہم) علاوہ اس کے تاکید توابع کی قسم سے ہے - اور توابع اپنے متبوع کی تعریف وتنکیر میں موافق ہوتا ہے - پھر کیا وجہ ہے کہ الناس تو معروف باللام اور اجمعین نکرہ -

پادر صاحبان! انصاف سے کہیئے کہ (بقول پادری سلطان محمد خان صاحب) بوجہ پیرانہ سالی یا بوجہ وہابی ہونے کے صرف ونحو میں بھولا ہوں؟

(شیر افگن)

یا پادری صاحب نے پڑھی ہی نہیں، یا عیسائیت کی وجہ سے آپ کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ ؎

جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اُسے ایک دم میں بھلا دیا

سنیئے! آیت موصوفہ کے معنے ہیں کہ

"انسان کی جملہ انواع اور جملہ اصناف سے دوزخ بھری جائے گی۔"

یعنی ایشیائی ہوں یا یورپی - افریقی ہوں یا امریکی " مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا " کے ماتحت اپنے اعمال کا بدلہ پائیں گے ۱۲

ع؎ جو کوئی اچھے کام کرتا ہی اپنے لئے کرتا ہی اور جو بُرا کرتا ہی وہ اپنی گردن پر اُٹھائیگا ۱۲

الفاظ یہ ہیں:

"احادیث کی رُو سے نجات پانے کی تین صورتیں ہیں۔ (۱) یہ کہ اعمال کا تعلق نجات سے مطلق نہیں صرف ہے بلکہ سخت گنہ گار انسان جس کی ساری عمر گناہوں میں صرف ہوئی ہو وہ مرتے دم جنت میں داخل ہو جائیگا اور بہت ہی نیک انسان جس کی کل نیکی میں صرف ہوئی ہو وہ مرتے وقت دوزخ میں وارد ہوگا۔ ذیل کی احادیث ملاحظہ ہوں:

"حضرت انس کہتے ہیں: کہ آنحضرتؐ سوار تھے اور معاذ ان کے ردیف تھے (یعنی ان کے پیچھے سوار تھے) تین مرتبہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ وہ صدق دل سے اشہدان لا الٰہ الا اللہ و اشہدان محمد رسول اللہ (یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا ایک ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں) کہے مگر خدا اسکو آتش دوزخ پر حرام کر دیگا۔ معاذ نے کہا۔ یا رسول اللہ! کیا لوگوں کو اس کی بشارت نہ دوں؟ تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اس حال میں وہ اسی پر بھروسہ کرینگے۔ معاذ نے اپنی موت کے وقت یہ حدیث سنائی۔ (مشکوٰۃ کتاب الایمان)

اسی مضمون پر ابی ذرؓ سے بھی ایک حدیث مروی ہے جس کے کھلے الفاظ اس بات پر ناطق ہیں کہ نجات بالاعمال کوئی چیز نہیں۔ حتےٰ کہ زانی اور چور صرف لا الٰہ الا اللہ کہنے سے نجات پاتا ہے۔ وہ یہ ہے۔

"ابی ذرؓ نے کہا میں آنحضرت صلعم کے پاس آیا آپ سو رہے تھے اور آپ پر سفید کپڑا تھا۔ جب میں پھر آیا تو آپ جاگتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر بندہ جو لا الٰہ الا اللہ کہے اور اس پر مر جائے وہ جنت میں داخل ہوگا میں نے کہا اگرچہ چور یا زنا کار ہو آپ نے فرمایا اگرچہ وہ چور یا زانی ہو پھر میں نے کہا اگرچہ وہ چور یا زانی ہو آپ نے فرمایا اگرچہ چور یا زانی ہو پھر میں نے کہا۔ اگرچہ وہ چور یا زانی ہو۔ آپ کہا اگرچہ وہ چور یا زانی ہو۔ اگرچہ یہ بات ابوذرؓ کو ناگوار معلوم ہوتی ہے۔"

مجھے ایک حدیث اور مل گئی جو کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بمثل اور بنظیر ہی بچوں کے لئے مصری کی ڈلی سے کچھ کم شیریں نہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان خواہ نیکی کرے یا بدی صرف چند الفاظ بولنے سے جنت میں جا سکتا ہے اور وہ یہ ہیں:

"عبادہ بن صامت نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ گواہی دے کہ خدا ایک ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور محمدؐ اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے اور عیسیٰ اس کا بندہ اور اس کا رسول اور اس کا کلمہ ہے جو مریم پر القا کیا گیا اور خدا کا روح ہے اور جنت و دوزخ حق ہے۔ خدا اس کو جنت میں داخل کر دیگا چاہے وہ جو کرتا ہو۔" (مشکوٰۃ کتاب الایمان)

احادیث بالا کے پڑھنے سے میرے دل میں خود بخود یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا یہ انصاف ہوگا کہ جس شخص نے اپنی عمر فسق و فجور، زنا و سرقہ میں صرف کی ہو اور نیک اعمال کا نام تک نہ لیا ہو وہ تو بوقت مرگ جنت میں داخل اور ایسا شخص جو عمر بھر زہد و تقویٰ اور نیکی میں زندگی بسر کرتا رہا ہو وہ مرے اور دوزخ میں ٹھونس دیا جائے۔"

(رسالہ "میں کیوں مسیحی ہوا" ص۳۴ تا ۳۷)

مسلمان شکر ہے جو بات ہم کہنا چاہتے تھے وہی آپ نے کہی کہ

"ایک آدمی (غیر عیسائی) عمر بھر تقویٰ اختیار کرے مگر مسیح کا کفارہ نہ مانے وہ بعد موت نجات نہ پائے بلکہ دوزخ میں جائے اور ایک بدمعاش ہر قسم کے گناہ کرے اور کفارہ پر یقین کر کے نجات پا جائے۔" (یا للعجب)

جناب پادری صاحب! اب تو آپ کالج کے پروفیسر ہو گئے۔ اس لئے اب آپ خوب سمجھ جائیں گے کہ امتحان کے وقت جو طالب علم سوال کا جواب دے وہی پاس ہوتا ہے جو نہ دے وہ نہیں ہوتا۔ چاہے پہلے اس کو ساری کتاب از بر ہو۔ یہی اصول اس حدیث میں بتایا ہے کہ خاتمہ کا اعتبار ہے۔ سچ ہے ؎

ایماں چو سلامت بلب گور بریم
احسنت و زہے چستی و چالاکی ما

علاوہ اس کے میں کہونگا کہ آپ نے احادیث پر غور نہیں کیا۔ حدیث مذکورہ کا مطلب یہ ہے کہ بعض دفعہ آدمی بُرے کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کی نگاہ میں وہ جہنم کے لائق ہوتا ہے مگر قریب موت وہ ان گناہوں سے توبہ نصوح کر کے اعمال حسنہ کرنے لگ جاتا ہے تو بخشش کے لائق ہو جاتا ہے یعنی توبہ خالص کی وجہ سے

سابقہ گناہوں سے پاک وصاف ہو کر خاتمہ بخیر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرا شخص عمر کا بہت حصہ نیک کام کرتا ہے مگر قریب موت صحبت بد میں پھنسکر کفر، شرک اور دیگر اعمال قبیحہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ جہنم کے لائق ہو جاتا ہے۔

مسیحی دوستو! کیا تمھیں اس میں شک ہے کہ ایک شخص ساری عمر ہندو دھرم میں ٹھاکر داس رہا۔ مگر مرنے سے کچھ عرصہ پہلے وہ اعتقاداً پادری صاحب بن گیا۔ کیا اس کی نجات نہ ہوگی؟ اسی طرح ایک ساری عمر مسیحی رہا۔ بلکہ فادر (پادری) بن کر بہتوں کو عیسائی مذہب میں لایا۔ لیکن مرنے سے پہلے وہ کفارہ کا اعتقاد ترک کر چکا۔ کیا وہ آپ کے خیال میں نجات سے محروم نہ ہوگا؟

پادری صاحب! ؎

آنچہ بر خود نہ پسندی، بدیگراں مپسند

دوسری بات جو پادری صاحب کو حدیثوں سے معلوم ہوئی وہ یوں اظہار کرتے ہیں:

"دوسری بات جو احادیث سے ثابت ہوئی وہ یہ ہے کہ نجات خدا کے رحم پر موقوف ہے حتیٰ کہ خود آنحضرت خدا کے رحم کے محتاج ہیں۔ اگر خدا آپ پر رحم نہ کرے تو اپنے اعمال کی وجہ سے آپ نجات نہیں پا سکتے، وہ احادیث یہ ہیں:

"ابی ہریرہؓ نے کہا کہ فرمایا آنحضرت صلعم نے ہرگز تم میں سے کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دے سکتا۔ لوگوں نے کہا آپ کو بھی نجات نہیں دے سکتا؟ آپنے کہا کہ نہیں۔ مگر جب خدا مجھ کو اپنی رحمت میں چھپا لے پس مضبوط رہو اور کوشش کرو اور صبح و شام اور ہر وقت عمل میں کوشش کرو۔"

(دوسری حدیث)

"جابر نے کہا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کر سکتا اور نہ اُن کو دوزخ سے پناہ دے سکتا ہے اور نہ مجھ کو مگر خدا کی رحمت سے"

احادیث بالا میں مجھ کو قابلِ غور یہ بات معلوم ہوئی کہ جبتک خدا کا رحم شامل حال نہ

کوئی شخص نجات نہیں پا سکتا۔ اس لئے مجھ کو یک گونہ تسلی تو ہوئی لیکن ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ :

"اگر خدا رحیم ہے تو وہ عادل بھی ہے۔ اگر خدا صرف اپنے رحم سے معاف کر دے تو صفت عدل معطل رہیگی اور تعطل سے خدا کی ذات میں نقص وارد ہو گا جو خدا کی شان کے شایان نہیں پس رحم سے نجات کامل پانا محال عقلی ہے اور اگر خدا ایسا کرتا ہے تو خدا صرف مسلمانوں کا خدا تو ہے نہیں وہ کل انسان اور ما فی الکون کا خدا ہے۔ لہٰذا اس کی رحمت کل کے لئے ہونی چاہیئے یعنی مشرکوں اور بُت پرستوں پر بھی رحم کرنا لازم ہے لیکن خدا مشرکوں اور بت پرستوں کو معاف نہیں کرتا۔ ورنہ[1] انبیاء کا مبعوث ہو جانا کتب سماوی کا نازل ہونا یہ سب عبث ٹھہرینگے۔ چونکہ یہ عبث نہیں پس صرف رحم سے نجات کی توقع رکھنا غلط ہے۔"

تیسری بات جو مجھ کو احادیث سے معلوم ہوئی یہ ہے کہ آنحضرتؐ بھی کسی کو نہیں بچا سکتے۔ یہاں تک کہ اپنے قرابت داروں اور بیٹی فاطمہ کو بھی بچانے سے قاصر ہیں پس یہ خیال کہ قیامت کے دن آنحضرت شفاعت کرینگے جس کے متعلق میرا گمان تھا کہ صحیح ثابت ہو گا غلط ثابت ہوا۔ وہ حدیث یہ ہے :

"ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ پر جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اپنے قریب رشتہ داروں کو ڈرا تو آنحضرت کھڑے ہو کر فرمانے لگے کہ اے قریش کے لوگو! اے عبد مناف کے بیٹو! اے عباس عبد المطلب کے بیٹے! اے صفیہ میری پھوپھی! میں تم کو قیامت کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ تم خود اپنی فکر کر لو۔ اے میری بیٹی فاطمہ! تو میرے مال سے سوال کر سکتی ہے لیکن میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا ہوں تو اپنی فکر آپ ہی کر۔"

پس احادیث کی وسیع اور دقیق چھان بین کے بعد میرے لئے کوئی حالت منتظرہ باقی نہ رہی جس کی میں اور انتظار کرتا۔ لہٰذا میں نے یاس و حرماں کے ساتھ احادیث کو بھی بند کر دیا۔"

(رسالہ "میں کیوں مسیحی ہوا" ص ۳۷ تا ۳۹)

مسلمان: سچ تو یہ ہے کہ الہامی نوشتوں کی اصطلاحات اور اسرار سے واقف ہونا

---

[1] ناظرین فقرہ زیر خط کو ملحوظ رکھیں۔ آگے چلکر ہم اس سے کچھ کام لینگے ۱۲ (مصنف)

معترض ہونے سے مقدم فرض ہے۔ اس کے بغیر اعتراض کرنا بادر ہوا ہوتا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کا خدا سے جو رشتہ ہے وہ مقتضی ہے کہ انسان دم بھر بھی خدا کی یاد سے غافل نہ ہو۔ شیخ سعدی مرحوم نے گلستان کے شروع ہی میں اس راز کو لکھا ہے کہ "بر ہر نفسے دو نعمت و بر ہر نعمت شکرے واجب" اس لحاظ سے انسان کے اعمال شرعیہ بھی اس کی نجات کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اُن میں بھی بہت سا وقفہ ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے سانس اور کاموں میں خرچ کرے اور شکر واجب سے غافل ہو جائے۔

یہ عارفانہ نکتہ سمجھانے کو حضور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث فرمائی ہے۔ (صدق اللہ ورسولہ)

بیشک اعمال شرعیہ اتنی حیثیت نہیں رکھتے کہ دنیاوی نعماء کا شکر ادا ہونے کے بعد نجات اُخروی کے لئے بھی علت ہو سکیں۔ ہاں محض اس کا فضل ہی فضل ہے کہ چند لمحوں کی اطاعت کو دائمی راحت (نجات) کا موجب بنا دیا۔ یہ تشریح ہے حدیث مذکور کی۔

پادری صاحب! معاف فرمائیے آپ نے کسی محدث سے علم حدیث پڑھا ہوتا تو آپ کو بتاتا کہ دیکھو اسی حدیث میں سرور کائنات عملوں کی تاکید فرماتے ہیں جو آپ کے ترجمہ میں بھی ملتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"آپ کا رسالہ" میں کیوں مسیحی ہوا" صـ۳۷)

کیا وجہ کہ پہلے تو اعمال کے موجب نجات ہونے سے انکار کیا۔ پیچھے اعمال کی تاکید فرمائی۔ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم بتا آتے ہیں کہ اعمال اپنی ذاتی حیثیت سے ہرگز موجب نجات نہیں۔ مگر بیکار بھی نہیں۔

لیجئے! حق بر زبان جاری مے شود۔ پادری صاحب خود بھی (غالباً) ہماری تاکید کرنے کو لکھتے ہیں:

"ناظرین! آپ اس بات کو ذہن نشین فرمائیں کہ ہم عیسائی اعمال حسنہ کے کرنے سے ہرگز منکر نہیں ہیں، بلکہ سچے مسیحی کی شناخت یہی ہے کہ وہ اعمال حسنہ کرنے میں ہر وقت بلکہ ہر ثانیہ ساعی اور کوشاں رہے مگر ہم نجات کا انحصار اعمال حسنہ پر نہیں کرتے کیونکہ کوئی فرد بشر اپنے واجبات سے سبکدوش نہیں ہو سکتا پس وہ ایسا زائد الفرض عمل کر ہی نہیں سکتا جو اس کے لئے کفارہ ہو۔"

(رسالہ "میں کیوں مسیحی ہوا" حاشیہ ص۳۶)

پادری صاحب اور ان کے اعوان و انصار غور کریں کہ ہمارے اور پادری صاحب کے بیان میں کتنا کچھ فرق ہے۔ فرق بھی ہم ہی بتائے دیتے ہیں۔ تاکہ فیصلہ آسان ہو۔

اوّل تو پادری صاحب کے قول میں تشتت اور اختلاف بہت ہے۔ آپ لکھتے ہیں: (۱) ہم نجات کا انحصار اعمال حسنہ پر نہیں کرتے۔ (۲) کوئی بشر واجبات سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ (۳) زائد الفرض نہیں کر سکتا جو کفارہ ہو۔

پہلے فقرے میں اعمالِ حسنہ سے مراد نیک کام ہیں۔ تیسرے فقرے میں زائد الفرض بھی نیک کام ہی ہیں جن کو کفارہ کہا گیا۔ جب زائد الفرض (درصورت ہونے کے) کفارہ ہو سکتا ہے تو پھر اعمال حسنہ پر نجات کے منحصر ہونے سے انکار کیوں۔؟

دوسرے فقرے میں واجبات اور تیسرے میں فرض سے مراد ایک ہی ہے یعنی وہ کام جن کا شریعت کی طرف سے انسان مامور ہوا ہے تو پھر تیسرے فقرے میں زائد الفرض کی کیوں پچ لگائی گئی۔ سیدھی بات یوں تھی کہ واجبات ادا نہیں کر سکتا جس کا جواب ہم دیتے کہ جتنا ہو سکے کرے، جتنا نہ ہو اس کے لئے توبہ کرے۔ اور بس۔

خیر یہ تو ہوا آپ کی عبارت کا تشتت جو قابل معافی ہے۔ اب سنیئے ہمارا اور آپ کا فرق کیا ہے۔

آپ اعمال حسنہ شرعیہ کو کسی طرح موجب نجات نہیں مانتے۔ ہم اعمال شرعیہ کو (بجعل الجاعل) موجب نجات مانتے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید میں

ارشاد ہے:

كُلُوا وَاشْرَبُوا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ (پ ۲۹ ع ۵)

(اے نجات یافتہ لوگو! کھاؤ پیو بسبب اُن کاموں کے جو تم نے گذشتہ عمر (دنیا) میں کیے)

اور حدیث شریف میں جو نفی آئی ہے اس سے اعمال کی ذاتی حیثیت مراد ہے۔ اس کی مثال بالکل یہ ہے کہ آقا اپنے غلام کو حکم دیتا ہے کہ ایک سال تک تم ایک روپیہ ماہوار مجھے دیا کرو تو میں تم کو آزاد کردوں گا۔ آزادی کے مقابلہ میں ایک روپیہ فی نفسہٖ کچھ چیز نہیں۔ لیکن (بجعل الجاعل) مالک کے کہنے سے یہی روپیہ موجب آزادی ہوگیا۔ غلام بعد آزادی کے کہہ سکتا ہے کہ میں اتنے روپے دے کر آزاد ہوا۔ انہی معنی میں اہلِ منطق ممکن کے حق میں کہا کرتے ہیں۔ "الشئ مالم یجب لم یوجد"

اس تشریح پر (کہ اعمالِ صالحہ بجعل الجاعل موجب نجات ہیں) آپ سے تصدیق کراتا ہوں غور سے دیکھئے متصرف علی القلوب والاقلام آپ سے کیسی تصدیق کراتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"ورنہ انبیاء کا مبعوث ہونا، کتب سماوی کا نازل ہونا یہ سب عبث ٹھہرینگے۔"

(رسالہ "میں کیوں مسیحی ہوا" صفحہ ۳۸)

پس اگر اعمال صالحہ نجات میں کارآمد نہیں تو انبیاء اور کتب سب عبث ہوں گے۔

مزید تصدیق چاہو تو سنو! حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں:

"تو زندگی میں داخل ہوا چاہتا ہے تو حکموں پر عمل کر۔"

(انجیل متی ۱۹ باب ۱۸ ورس)

زندگی سے مراد نجات ہے۔ معنے یہ ہیں کہ جو نجات چاہے وہ نیک عمل کرے۔ پس مسیح۔ محمدؐ۔ موسیٰ اور داؤد (علیہم السلام) سب کی آواز ایک ہی ہے۔

پادری صاحب! ؎ چو بشنوی سخن اہلِ دل مگو کہ خطا ست

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجا ست

پادری صاحب چونکہ پیدائشی مسلمان ہیں اس لئے بوقت قبول مذہب عیسائی آپ کا فرض تھا کہ ترک اسلام کی وجوہ بتاکر قبول عیسویت کی وجوہ بھی بتاتے چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اُن کے رسالہ کا نام ("میں کیوں مسیحی ہوا") ہی اُن پر یہ فرض عائد کرتا ہے۔ اسی لئے آپ نے اسلام میں نجات نہ ملنے کی وجوہ بتاکر صاف لفظوں میں یہ عنوان دیا ہے:

"انجیل میں مجھے نجات مل گئی" اسی حالت رنج والم میں مَیں پھر ایک بار انجیل مقدس کو اٹھاکر دیکھنے لگا۔ بدیں خیال کہ اگر میری تحقیقات میں غلطی رہ گئی ہو تو اس کی اصلاح ہو جائے۔ اب کی بار انجیل مقدس کھولتے ہی جس آیت پر میری نظر پڑی وہ یہ تھی:۔

"اے تم جو تھکے اور بڑے بوجھ سے دبے ہوئے ہو میرے پاس آؤ کہ مَیں تمہیں آرام دوں گا۔" (متی ۱۱: ۲۸)

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ کس طرح انجیل متی کا یہ باب کھل گیا اور اس آیت پر میری نگاہ پڑ گئی نہ تو مَیں نے قصداً اس باب کو کھولا تھا اور نہ یہ کوئی امر اتفاقی تھا بلکہ یہ خدا کی طرف سے میری سخت محنت اور سچی تحقیقات کی مکافات، اور مجھ جیسے گنہگار شخص کے لئے علی الاعلان خوشخبری اور بشارت تھی۔ مجھ پر اس آیت جاں بخش کا بہت بڑا اثر ہوا دل میں تسلی، اطمینان اور سرور پیدا ہو گیا، دل کی بیقراری اور اضطراب بیکقلم کافور ہو گئے۔

اس (انجیلی) آیت پر زیادہ غور و خوض کرنے سے مجھ کو ایک نئی بات معلوم ہو گئی اور وہ یہ کہ مسیح کہتے ہیں کہ (۱) "مَیں تم کو آرام دونگا" وہ نجات کو اپنی ذات پر موقوف و منحصر بتلاتے ہیں یہ ایک عجیب بلکہ اعجب بات ہے۔ (۲) مسیح اور باقی بانیانِ مذاہب میں یہ ایک بیّن امتیاز ہے جس پر بہت کم غور کیا جاتا ہے اور بانیان مذاہب کسی کا ذمہ اپنے اوپر نہیں لیتے ہیں، وہ صرف ایک راستہ بتلانے والے کی حیثیت رکھتے ہیں مسافر خواہ منزل مقصود تک پہنچے یا نہ پہنچے، ان کی بلا سے لیکن مسیح اپنے آپ کو "راہ حق اور زندگی میں ہوں"، میرے بغیر کوئی میرے باپ کے پاس نہیں جا سکتا ہے"۔ یوحنا ۱۴: ۶) کہہ کر نجات کا

بانی مبانی بتلاتے ہیں " (رسالہ "میں کیوں مسیحی ہوا" ص۴)

مسلمان بہت خوب۔ اتنی سی بات پر آپ خوش ہیں تو لیجئے جس مذہب (اسلام) کو آپ نے ترک کیا ہے اس کی کتاب (قرآن مجید) میں بھی اس مضمون کی آیت آپ کو مل سکتی ہے۔ غور سے سنیئے!

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا۔ (پ ۲۴، ع ۳)

"میرے گنہگار بندوں کو کہدیجئے کہ تم خدا کی رحمت سے بے امید نہ ہو اللہ سب گناہ بخشدیگا۔"

پادری صاحب! ذرا غور کیجئے کہ تلطف اور کس مہربانی سے خدا کی رحمت کی طرف بلایا جاتا ہے۔ ان کو اپنے بندے کہہ کر گناہ گار کہہ کر تمام گناہوں کی بخشش کا وعدہ دے کر (سبحانہ ما اعظم شانہ)

اگر خیال شریف میں آئے کہ یہ تو صرف مجمل عنوان دعوت ہے۔ ورنہ تفصیل میں اعمال کو دخل کر دیا ہے تو جواباً معروض ہے کہ حضرت مسیح کا ارشاد بھی تو یہی ہے جو گذشتہ نمبر میں ہم نقل کر آئے ہیں۔

"اگر تو (سلطان محمد) زندگی میں داخل ہوا چاہتا ہے تو حکموں پر عمل کر"۔ (انجیل متی ۱۹ باب ۱۸)

پادری صاحب! صداقت اور دیانت کے واسطے سے ان دونوں تعلیموں پر غور کیجئے۔ اگر دونوں برابر ہیں تو ایک کو چھوڑ دوسری لینے سے کیا فائدہ؟ اور اگر دونوں میں فرق ہے تو کیا ہے؟

بڑی بات جو آپ نے لکھی ہے وہ یہ ہے کہ "مسیح نجات کو اپنی ذات پر موقوف بتلاتے ہیں"۔ لیجئے اگر یہی بات آپ کو مسیحی مذہب میں لے گئی ہے تو قرآنی ارشاد بھی سُن لیجئے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ۔ (پ ۳ ع ۱۲)

"(بحکم خدا ارشاد ہی) اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ پادریوں وغیرہم کو

کہدیجئے کہ اگر تم واقعی دل سے اللہ کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تم سے پیار کرے گا۔"

پادری صاحب! بس اب تو آپ خوش ہو جئے کہ آپ کے پیدائشی اور موروثی مذہب میں بھی وہ بات مل گئی جو عیسائی مذہب میں آپ کے لئے دل خوش کن ہوئی۔

دوسرے فقرے میں آپ نے تنقیح خوب نکالی جس کی ہم داد دیتے ہیں یعنی بقول آپ کے مسیح فرماتے ہیں:

"راہِ حق اور زندگی میں ہوں۔ میرے بغیر کوئی میرے باپ (خدا) کے پاس نہیں جا سکتا۔"

یہی مضمون قرآن مجید میں ملتا ہے۔ غور سے سنیئے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (پ ۹ ع ۱۰)

"(اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہدیجئے۔ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ تمام آسمانوں اور زمینوں پر جس کی حکومت ہے اُس کے سوا دوسرا کوئی معبود نہیں وہی زندگی دیتا ہے اور مارتا ہے۔ پس تم اللہ پر اور اُس کے رسول اُمّی پر ایمان لاؤ جو اللہ کو اور اس کے کلمات کو مانتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ ہدایت یاب ہو جاؤ۔"

معلوم ہوتا ہے آپ کے دل میں کچھ اور ہے جو آپ ظاہر نہیں کرتے۔ اجازت ہو تو ہم ہی پیش کر دیں۔ غالباً بلکہ یقیناً وہی ہے جس نے عیسائی دنیا کو غلطی میں ڈال رکھا ہے کہ "مسیح ہمارے لئے کفارہ ہو گیا۔" اگر یہی خیال آپ کو کشاں کشاں مسیحی مذہب میں لے گیا تو ذرا اس کی حقیقت بھی سن لیجئے۔ ہمارے لفظوں میں نہیں۔ مسیحی مذہب کے الہامی لفظوں میں۔ یوحنا رسول کہتے ہیں:

اے میرے بچو! میں یہ باتیں لکھتا ہوں تاکہ تم گناہ نہ کرو۔ اور اگر کوئی گناہ کرے تو

یسوع مسیح جو صادق ہے باپ کے پاس ہمارا شفیع ہے وہ ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے۔" (یوحنا کا پہلا خط باب ۲ کی ۱)

پادری صاحب! یہی کفارہ ہے نہ؟ جس پر آپ کو ناز ہے جس کے لئے آپ مسیحی مذہب میں گئے ہیں۔ اچھا اس کی حقیقت بھی سنیئے۔ اس کے ساتھ یوحنا فرماتے ہیں:

"فقط ہمارے گناہوں کا نہیں بلکہ تمام دنیا کے گناہوں کا بھی۔ اگر ہم اُس کے حکموں پر عمل کریں تو ہم اس سے جانتے ہیں کہ ہم نے اُس کو جانا، وہ کہتا ہے کہ میں اُسے (مسیح کو) جانتا ہوں اور اس کے حکموں پر عمل نہیں کرتا۔ سو جھوٹا ہے اور سچائی اُس میں نہیں۔" (باب ا کی $\frac{3}{4}$)

مسیحی دوستو! پادری سلطان محمد خان صاحب کی حالت پر ہم کو رحم آتا ہے۔ بیچارے گئے تھے کہ مسیحی مذہب میں پکا پکایا مفت میں مل جائیگا لیکن وہاں بھی محنت ہی کرنے کا حکم ہوتا ہے تو کیا یہ مثل صادق ہونے میں کلام ہے؟

"تبلی بھی کیا اور روکھا بھی کھایا"

ناظرین کرام! پادری صاحب کے رسالہ کا یہاں تک خلاصہ تو صرف یہ ہے کہ

"اسلام تعمیل احکام پر نجات کا وعدہ دیتا ہے اور انجیل محض مسیح پر ایمان لانے سے نجات کا وعدہ دیتی ہے۔ عمل چونکہ مشکل ہیں۔ لہٰذا میں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا"

ہمارے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ

سلسلۂ انبیاء علیہم السلام سے غرض ہی یہ ہے کہ لوگ نیک اعمال سیکھیں، اور نیک عمل کریں ورنہ بقول پادری صاحب انبیا کا مبعوث ہونا، کتب سماوی کا نازل ہونا یہ سب عبث ٹھہریں گے (صـ۳۸) سلسلۂ نبوت و رسالت بیکار ٹھہریگا۔ اس لئے اسلام اعمال کی تاکید کرتا ہی مگر اعمال بالکلیہ نیک ہی ہوں یہ شرط نہیں کرتا بلکہ گناہ بھی اگر ہوں

مگر کثرت اعمال صالحہ کی ہو تو نجات انشاء اللہ ہو جائے گی۔ جناب مسیح اور دیگر انبیا یہی فرماتے گئے۔ غور سے سنیئے!:

"تم میری شریعت پر عمل کیجیو اور میرے حکموں کی محافظت کرنا اور ان پر عمل کرنا کہ تم زمین پر صحیح و سالم رہو گے اور زمین تم کو اپنے پھل دیگی اور تم پیٹ بھر کھاؤ گے اور اُس پر سلامت رہو گے۔" (توراۃ کی تیسری کتاب احبار ۲۵ کی ۱۸)

پادری صاحب! ے

عمر تھوڑی حسرتیں دل میں بہت   صلح کیجے بس لڑائی ہو چکی

پادری صاحب لکھتے ہیں:

"اس پر میرے دل میں ایک سوال پیدا ہوا۔ وہ یہ تھا کہ کیا مسیح کے اس عجیب و غریب دعوے پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ جواب ملا کہ فی الحقیقت اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ (۱) مسیح اہل اسلام کے نزدیک معصوم اولوالعزم وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ۔ کَلِمَةُ اللّٰهِ وَرُوْحُ اللّٰهِ وغیرہ اوصاف کاملہ سے موصوف ہیں۔ (۲) مسیحیوں کے نزدیک کامل خدا اور کامل انسان اور تمام اوصاف ناقصہ و صفات دنیّہ سے مبرّا و معرّیٰ ہیں۔ پس یہ ممکن نہیں بلکہ محال ہے کہ مسیح جو فریقین کے نزدیک متصف بہ صفات بالا ہیں۔ کوئی ایسا کام یا دعوے کریں جو اُن کی شان کے شایان نہ ہو۔"

(رسالہ "میں کیوں مسیحی ہوا" صفحہ ۴۰/۴۱)

مسلمان پادری صاحب نے اپنے دعوے پر دو گواہ پیش کئے ہیں پہلا گواہ اسلام ہے۔ (۲) دوسرا گواہ مسیحی مذہب۔

پادری موصوف اگر قانون شہادت کے معیار پر اپنے ان گواہوں کی شہادت کو جانچتے تو کبھی ان کو پیش نہ کرتے۔ اسلام کو تو اس لئے پیش نہ کرتے کہ اسلام کو وہ غلط مذہب سمجھ کر ترک کر چکے ہیں۔ جس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنے ہیں کہ پادری صاحب ایسے گواہ کو پیش کرتے ہیں جس کو خود ہی غلط گو کہہ چکے ہیں (۲)

(۲) مسیحیوں کو اس لئے آپ گواہ پیش نہیں کرسکتے کہ اُن کی شہادت اُن کو مفید ہے۔ جس گواہ کی گواہی خود اس کو مفید ہو قانون شہادت سے وہ شہادت مثبت مدعا نہیں ہوسکتی کیونکہ اس میں احتمال ہوتا ہے کہ یہ خودغرضی پر مبنی ہو۔

یہ تو آپ کے دو گواہوں کی بابت گفتگو تھی، ابھی اس شہادت پر جرح باقی ہے لیکن اس جرح سے پہلے ہیں آپ کا دعویٰ ذرا مفصل اور مشرح ناظرین کے سامنے لے آئیں۔ تاکہ معلوم ہوسکے کہ آپ کی پیش کردہ شہادت بعد جرح کے ایسے دعوے کو ثابت کرسکتی ہے؟

مسئلہ کفارہ کچھ شک نہیں کہ مروجہ عیسائی مذہب کی بنیاد بلکہ اصل مقصد کفارہ ہے۔ کفارہ کے متعلق ایک مضمون اخبار "نور افشان" میں (ہمارے مخالف پادری سلطان محمدؐ صاحب آجکل اس اخبار کے اڈیٹر ہیں) بہ عنوان "کفارہ کیا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے"؟ نکلا تھا جسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ جو یہ ہے:

"ہم کو خوب غور کرنے سے توریت کے مختلف مقامات سے اس لفظ کفارہ اور فدیہ اور مخلصی کی وجہ تسمیہ معلوم ہوجاتی ہے یعنی (۱) یہ گویا احکام شریعت کی عدم متابعت اور عدولی کو ڈھانپتا ہے جس کو انسان نے توڑ دیا تھا اور عہد اعمال کی خلاف ورزی کرنے کے باعث خدا ناراض تھا۔ اب یہ کفارہ کا فعل اس کی تمام تقصیروں اور گناہوں پر گویا پردہ ڈال دیتا ہے اور کفارہ کی بدولت گناہ خدا کی نظر سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ (۲) جب انسان کے گناہ ڈھانپ دیئے گئے تو یہی کفارہ خدا سے میل ملاپ کرنے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ یہودی شریعت میں سال میں ایک خاص دن مقرر تھا اس دن تمام امت کے گناہوں کا کفارہ دیا جاتا تھا یا یہ کہئے کہ امت کے گناہ ڈھانپے جاتے تھے اور اس کے بعد سلامتی کی قربانی چڑھائی جاتی تھی۔ اسی دن کی رسم اور قربانیوں کا مفصل ذکر احبار کی کتاب ۱۶: ۲۹ تا ۳۴ میں مندرج ہے۔ پس اس لفظ اور رسم سے ظاہر ہے کہ خدا نے کفارہ

کی تعلیم کو کیسا اہم اور ضروری ٹھیرایا ہے اور کفارہ کا یہ اصول بتادیا ہے کہ بلا خون بہائے گناہوں کی معافی نہیں ہوسکتی۔ جیساکہ احبار کی کتاب کے ۱۷: ۱۱ میں مرقوم ہے کہ:

"بدن کی حیات لہو میں ہے سو میں نے مذبح پر وہ تم کو دیا ہے کہ اس سے تمہاری جانوں کے لئے کفارہ ہو۔ کیونکہ وہ جس سے کسی جان کا کفارہ ہوتا ہے سو لہو ہے"

یہ اصول کبھی بدل نہیں سکتا۔ اس کی صورت اور شکل بدل سکتی ہے۔ لیکن اصول کبھی نہیں بدلتا۔ ہم اسی اصول و تعلیم کے مطابق جو توریت میں تفصیل کے ساتھ قلمبند ہے بدل وجان کفارہ کو مانتے ہیں۔ انجیل کی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز یہی تعلیم ہے اور خداوند مسیح کے آنے اور اس کے مجسم ہونے کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا۔ جیساکہ اُس نے خود اپنی زبان مبارک سے فرمایا کہ

"ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتوں کے فدیہ میں دے" (متی ۲۰: ۲۸)

(نور افشاں ۹۔ نومبر ۱۹۲۸ء صا۲/۱)

مسلمان یہ ہے عیسائی مذہب کے دعوے کی تصویر جس کا خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ:

"عیسائیوں کے گناہوں کے بدلے میں یسوع مسیح نے سزا پائی"

یہ تصویر دکھانے کے بعد اڈیٹر نور افشاں اپنے اس دعوے کی تشبیہات سناتے ہیں۔ جن سے اس دعوے کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

اس تعلیم کی کئی ایک تشبیہوں اور تمثیلوں کے ذریعے سے توضیح کی گئی ہے مثلاً: (۱) اس کو فدیہ یا زرِ مخلصی سے تشبیہ دی ہے۔ ان لفظوں سے

یہ تصور ہمارے سامنے کھینچا جاتا ہے کہ کوئی شخص غلام ہے جس کی غلامی کی وجہ یا تو یہ ہوگی کہ وہ لڑائی میں شکست کھا کر غلام بن گیا۔ یا ننگدستی کے باعث اُس نے اپنے آپ کو کسی کے ہاتھ بیچ دیا۔ اب اُس میں اتنی طاقت نہیں کہ اپنے آپ کو چھڑا سکے۔ نہ اس کے پاس سرمایہ ہے جس کو دے کر اپنی جان کی مخلصی کرائے۔ یہی حالت گنہگار انسان کی ہے۔ شیطان نے انسان کو اپنا غلام بنا رکھا ہے اور وہ گناہ کے ہاتھ بک گیا۔ بہرحال اب اسکی یہ حالت ہے کہ وہ اپنی طاقت اور لیاقت سے شیطان اور گناہ کے پنجہ سے مخلصی حاصل نہیں کرسکتا ایسے گنہگار کے لئے مسیح نے اپنی جان فدیہ میں بطور زرِ مخلصی کے دیکر اُسے رہائی دلوائی۔ اب وہ غلام نہیں بلکہ آزاد ہے۔

(۲) ملاپ سے تشبیہ دی ہے اس لفظ سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ گناہ کے باعث خدا اور انسان میں نفاق اور جدائی پیدا ہوکر باہمی میل ملاپ قائم نہ رہا تھا۔ بلکہ خدا اور انسان کے مابین بے حد جدائی تھی خدا کی پاک مرضی اور انسان کی گناہ آلودہ روش ایک دوسرے سے متفرق اور علی الرّغم تھی لیکن مسیح نے آکر اپنی جان دینے سے گنہگار و رافتادہ انسان کا خدائے سبّوح قدوس سے میل ملاپ کرا کے صلح کرادی۔

(۳) تیسری تشبیہ کفارہ ہے یعنی گناہوں کا ڈھانپنا۔ ہمارے گناہ بےشمار اور بےحد تھے اور ہم گناہوں کے باعث ناپاک ہوگئے تھے اور خدائے پاک کی نظر میں مکروہ تھے لیکن مسیح نے اپنی جان دینے اور خون بہانے کے ذریعہ سے ہمارے گناہوں کو ڈھانپ دیا۔ اب خدا ہمارے گناہوں پر نہیں بلکہ مسیح کی راستبازی پر نظر کرتا ہے۔

(۴) چوتھی تشبیہ معافی کی تشبیہ ہے۔ یہ لفظ قرضہ کے چھوڑ دینے پر

دلالت کرتا ہے۔ شریعت کے حکموں کو پورے طور سے ادا کرنا ہمارا فرض کلی ٹھہرایا گیا تھا۔ گویا خدا کا یہ قرض ہم پر تھا لیکن ہم نے اس قرض کو ادا نہ کیا۔ اسلیئے ہمارا انجام اسی قسم کا ہونیوالا تھا جو ایک نادہندہ قرضدار کا ہوتا ہے لیکن مسیح نے بذاتِ خود اس قرض کو ہمارے عوض ادا کر کے خدا کے قرض واجب الادا سے معافی دلا دی"۔ (نور افشان ۹ نومبر ۱۹۲۸ء صہ)

مسلمان یہی تمثیلات دیگر عیسائی مصنفوں نے بھی لکھی ہیں۔ مگر ان میں ایک نقص یا سہل انگاری یہ ہے کہ ان مصنفوں نے اس امر کا فیصلہ نہیں کیا کہ شرعی گناہ فوجداری کیس ہے یا دیوانی؟

مثلاً بدکاری کی سزا شرع میں جہنم کی قید ہے یا مالی جرمانہ ہے۔ کچھ شک نہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی شریعت میں گناہوں کا مقدمہ فوجداری کیس ہے دیوانی نہیں۔ پس جب فوجداری کیس ہے تو فوجداری میں اصل الاصول قانون ہے کہ:

"جو کرے وہی بھرے"

پادری صاحب کے دعوے کی تصدیق اور آپ کی تشبیہات کی تصحیح ہم اس وقت کرینگے جب آپ کبھی جیلخانوں میں جاکر داروغہ جیل کی اجازت سے کسی غریب کمزور مجرم کی مشقت خود اٹھا کر کم سے کم ایک روز تو اس کو آرام دلوائیں۔ دیکھئے ایسا کرنے کی اجازت ملتی ہے یا وہی سنایا جاتا ہے جو قرآن مجید نے سنایا:

"لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی
کوئی کسی کا گناہ اپنے اوپر نہیں اٹھائیگا"

ہاں اس کی مثال ہم سے سنیئے! شرعی سزاؤں کی مثال دنیا میں طبی سزا ہے جو خود خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ طبی اصول سے بدپرہیزی کرنے والا جوان ہو یا بوڑھا، بالغ ہو یا نابالغ، جو کرتا ہے وہی بھرتا ہے۔ ایک شیر خوار بچے کے پیٹ میں کوئی مضر چیز داخل ہو جائے تو وہی تکلیف اٹھاتا ہے دوسرا کوئی نہیں ماں باپ اور عزیز و اقارب قربان ہو جانے کو تیار ہوتے ہیں لیکن تکلیف اپنے پر لینا کیا

بھی نہیں کر سکتے۔

پادری صاحب! یہ ہے خدائی سزا کی مثال۔ آپ لوگوں کو غلطی لگتی ہے کہ آپ شرعی جرائم کو دیوانی مقدمہ بناتے ہیں، حالانکہ فوجداری کیس ہے۔

ابھی اور سنیئے شرعی جرائم میں سے ہر ایک جرم کی سزا اتنی ہے کہ دنیا میں انسانی طاقت اس کی برداشت نہیں کر سکتی۔ پھر ایک انسان کے سارے گناہوں کی سزا کتنی ہوگی۔ اور سارے انسانوں کی کتنی۔ اس کا حساب لگا کر دیکھئے، اور ضامن (مسیح) کی سزا کا اندازہ لگائیے۔ بقول عیسائیاں صرف تین روز دوزخ میں رہا جس سے سارے گناہگاروں کی نجات ہوگئی۔ الامان! یہ ہے وہ انصاف اور عدل جس کے پورا کرنے کے لئے ایک بیگناہ معصوم محفوظ نبی اور رسول (بلکہ بقول عیسائیاں اپنے بیٹے) کو پھانسی دیا اور دوزخ میں ڈال کر اپنا عدل و انصاف پورا کیا۔ بلکہ سارے سلسلۂ انبیاء کو باطل ٹھہرایا۔ انا اللہ!

اور سنیئے یہ تو تھی مسئلہ کفارہ کی تصویر اور اس پر گفتگو جس کی وجہ سے ہمارے عزیز برادر مولوی سلطان محمد سے پادری بال بنے۔ اب ہم بال صاحب کے حصہ کلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ

"مسیحیوں کے نزدیک (مسیح) کامل خدا اور کامل انسان ہے۔"

بیشک یہی عقیدہ آپ کے مقدس اتھاناسیس نے نجات کے لئے مقرر کیا ہے۔ چونکہ آپ منطق جانتے ہوں گے اس لئے میں منطقی اصطلاح میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ کچھ شک نہیں کہ انسان اور خدا دو مختلف الماہیت ہستیاں ہیں۔ ایک واجب دوسری ممکن۔ مسیح ان دونوں سے مرکب ہے یا مفرد؟ مفرد ہے تو آپ نے "اور" کے لفظ سے کیوں بنایا؟ دونوں سے مرکب ہے تو مرکب بحیثیت مرکب حادث ہوتا ہے۔ لہٰذا مسیح بحیثیت ترکیب کے حادث ہوا۔ حادث ہوا تو مخلوق ہوا مخلوق ہوا تو قدیم نہ ہوا، قدیم نہ ہوا تو انجیل کے جس فقرے کو عیسائی لوگ مسیح کی ذات پر پیش کیا کرتے ہیں۔

"ابتدا میں کلام تھا - کلام خدا کے ساتھ تھا - کلام خدا تھا"

اس کے کیا معنے ہونگے؟ ذرا سوچ سمجھ کر کہئے گا - جلدی نہ کیجئے گا ۔

ستعلم لیلی ای دین تداینت — وای غریم فی التقاضی غریمہا

پادری صاحب نے مسیحی مذہب کا عطر نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا جس کے لئے ہم اُن کے شکر گذار ہیں - آپ فرماتے ہیں :-

"پھر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مسیح مجھ کو کس طریقہ سے نجات دینے کا وعدہ کرتے ہیں - کیا پھر مجھ کو اسی راہ پر جانا پڑیگا جس سے میں ہو کر آیا ہوں اس خیال کے تصفیہ کے لئے اناجیل میں ڈھونڈنے لگا تو یہ آیت مجھ کو ملی کہ "ابن آدم اسلئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتیروں کے بدلے فدیہ میں دے" (متی ۲۰ : ۲۸)

اس آیت کے پڑھنے سے مجھ کو وہ طریقہ معلوم ہو گیا جس سے نجات ملتی ہے یعنی مسیح اپنی جان ہم گنہگاروں کے معاوضہ میں دیکر خدا کے غضب سے بچاتا ہے ایک عجیب طریقہ ہے جس کی مثال دنیا پیش نہیں کر سکتی - دنیا میں کثرت سے بانیان مذاہب ہو گذرے ہیں لیکن کسی نے اپنی جان کسی کے لئے نہیں دی اور نہ کسی نے دعویٰ ہی کیا - یہ صرف مسیح ہی کا کام تھا جس کو اس نے پورا بھی کر دیا - یہ سوچ کر وجد میں آ گیا مسیح اور اس کی محبّت کی تصویر جو وہ انسانوں کے ساتھ رکھتا ہے میرے دل اور آنکھوں میں جم گئی" (رسالہ "میں کیوں مسیحی ہوا" صہ ۴۱)

مسلمان بس یہی وہ اصلی گر ہے جو آپ کو اسلام سے ہٹا کر مسیحیت میں لے گیا - بات بھی آپ نے سچی کہی کیونکہ مروجہ مسیحی مذہب کی جان اور امتیازی نشان بس یہی کفارہ مسیح ہے اور بس جس کے متعلق ہم گذشتہ نمبر میں ذکر کر آئے ہیں - یہاں ہم صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ :

(۱) اگر یہی طریق نجات ہے تو پہلے نبیوں کی امتوں کی نجات کس طرح ہو گی ؟

(۲) اگر یہی طریق نجات خدا کے ہاں مقرر تھا تو شروع دنیا میں سب سے پہلے نبی پر

اس کو کیوں ظاہر نہ کیا تا کہ رحم اور عدل برابر قائم رہتا۔

(۳) اگر ذریعہ نجات خدا کے رحم سے مسیح کی موت ہے تو پھر مسیحی ہونے کی کیا ضرورت ہے خدا نے سب کے گناہوں کی بخشش کا انتظام فرمایا ہے کسی خاص گروہ کا نہیں۔

(۴) محض مسیحی کفارہ اگر کافی ہے تو یوحنا رسول کیوں کہتے ہیں۔

"جو کہتا ہے کہ مَیں اُسے مانتا ہوں اور اس کے حکموں پر عمل نہیں کرتا سو جھوٹا ہے اور سچائی اس میں نہیں۔ ہر وہ جو اس کے کلام پر عمل کرے یقیناً اس میں خدا کی محبت ہے۔" (یوحنا کا پہلا خط باب ۲ : ۳)

ناظرین! باوجود اس عملی تاکید کے پادری صاحب کی جرأت دیکھئے کہ آپ لکھتے ہیں:

"مختصر یہ کہ مَیں ایک محققانہ روش سے اناجیل کا مطالعہ کرتا رہا۔ اور بالاستیعاب اول سے تک کئی بار پڑھا۔ مجھ کو سیکڑوں ایسی آیتیں اور بیسیوں ایسی تمثیلیں ملیں جن کے ملنے سے مجھ کو پورا پورا الیقین ہو گیا کہ نجات جو مذہب کی علّت غائی اور اس کی جان ہی بجز مسیحی مذہب کے اور کسی مذہب میں نہیں ہی اُن آیات میں سے مَیں یہاں فقط رومیوں کا تیسرا باب اور اس کی اکیسویں آیت سے چھبیسویں آیت تک نقل کرتا ہوں۔ وہ یہ ہیں:

"اب ہم جانتے ہیں کہ شریعت جو کچھ کہتی ہے ان سے کہتی ہی جو شریعت[1] کے ماتحت ہیں تاکہ ہر ایک کا منہ بند[2] ہو جائے اور ساری دُنیا خدا کے نزدیک سزا کے لائق ٹھہرے[3]۔ کیونکہ شریعت کے اعمال سے کوئی کے حضور راستباز نہیں ٹھہرے گا اسلئے کہ شریعت کے وسیلہ سے تو گناہ کی پہچان[4] ہی ہے مگر اب شریعت کے بغیر[5] خدا کی ایک راستبازی ظاہر ہوتی ہی جس کی گواہی شریعت اور نبیوں سے ہوتی ہی یعنی خدا کی وہ راستبازی جو یسوع مسیح پر ایمان لاتے سے سب ایمان والوں کو حاصل ہوتی ہے کیونکہ کچھ فرق نہیں۔

اس لئے کہ سب نے گناہ کیا، اور خدا کے جلال سے محروم ہیں۔ مگر اس کے فضل کے سبب اس مخلصی کے وسیلہ سے جو یسوع مسیح میں ہی مفت راستباز ٹھیرائے جاتے ہیں۔ اُسے خدا نے اس کے خون کے باعث ایک ایسا کفارہ ٹھہرایا جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہو تاکہ جو گناہ پیشتر ہو چکے تھے اور جن سے خدا نے تحمل کر کے طرح دی تھی ان کے بارے میں وہ اپنی راستبازی ظاہر کر دے"۔ (رومیوں باب ۳)

پس ان تمام تحقیقات و تدقیقات کے بعد جو آپ کے پیش نظر ہیں میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اب میں مسیحی ہو جاؤنگا۔ اور یہ بھی مناسب معلوم ہوا کہ میں اپنی تحقیقات کو اپنی انجمن ضیاء الاسلام میں پیش کر دوں تاکہ اس پر اگر چاہیں تو بحث بھی کریں اور خفیہ تحقیقات کا الزام میرے سر سے ہٹ جاتے۔ (رسالہ "میں کیوں مسیحی ہوا" صفحہ ۴۲۰ ۴۲۱)

مسلمان کیا ہی اچھی چیستان ہے۔ پادری صاحب کے رسالہ کی جان یہی عبارت ہے اور یہی مزلۃ الاقدام (مقام لغزش) جس میں پادری صاحب گرے ہیں۔ ناظرین کی توجہ کے لئے ہم نے اس عبارت پر نمبر لگا دیتے ہیں جن پر ہمیں تبصرہ کرنا ہے۔

نمبر اوّل کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدائی شریعت کے ماتحت دیندار ہیں شریعت انہی کے لئے ہے بدکاروں کے لئے نہیں، بالکل ٹھیک ہی بدکاروں کے حق میں تو قرآن مجید بھی کہتا ہے۔ مَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ

(پ ۱۱ - ع ۱۵)

نمبر ۲: "منہ بند ہو" ایک معنے سے سچ ہے قرآن مجید بھی یہی کہتا ہے:
رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ

(پ ۶ ع ۳) (یعنی رسولوں کا آنا اسلئے ہے کہ گناہوں پر بےخبری کا عذر نہ کریں)

نمبر ۳: خوب ہے کہ شریعت کا آنا اسواسطے ہے کہ دنیا سزا کے لائق ٹھیرے

یہ ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ قرآن مجید تو یہ کہتا ہے کہ:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ

"ہم (خدا) نے تجھ (نبی) کو اس لئے بھیجا ہے کہ ہم دنیا پر رحمت کریں۔ بندے احکام کی تعمیل کریں اور رحمت سے بہرہ ور ہوں"

نمبر ۴: بالکل سچ ہے۔ شریعت نہ ہو تو ہمیں کیا معلوم ہو کہ حرام کیا ہے۔ اور حلال کیا ہے۔ نجات کا طریقہ کیا ہے اور ہلاکت کیا ہے۔

نمبر ۵: سب نمبروں میں یہی ایک نمبر ہے جس پر مدار کار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جملہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ آئی ہوئی شریعت مسیح کے کفارہ سے سب باطل کی گئی۔ ہمارے اس دعوے کی واضح ترین دلیل پادری صاحب کی پیش کردہ عبارت کے آگے کا فقرہ ہے جو موصوف نے نقل نہیں کیا۔ وہ یہ ہے:

"آدمی ایمان ہی سے بے اعمال شریعت کے راستباز ٹھہرتا ہے۔"

(رومیوں باب ۳ کی ۲۸)

کیا خوب ناظرین! ان مسیحیوں کی دلیری اور جرأت دیکھئے کہ صرف پولس کے کہنے سے جو حضرت مسیح کے بعد ہوا جس کے الہامی ہونے کا کبھی ثبوت نہیں ملتا۔ سارے انبیاء کی شریعت کو یک لخت باطل ٹھیرایا گیا ہے کس جرأت سے کہتے ہیں۔

"صرف ایمان ہی سے بے اعمال شریعت راستباز ٹھیرتا ہے۔"

اس طرفہ پر طرہ یہ کہ یہی حضرت پولوس اسی مقام پر آگے چل کر فرماتے ہیں:

"کیا ہم شریعت کو باطل کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہوئے بلکہ ہم تو شریعت کو قائم کرتے ہیں۔"

(۳ باب ۳۱)

ناظرین! یہ ہے وہ پالیسی جو آج دول یورپ ایشیا اور افریقہ میں استعمال کرتی ہیں جس ملک پر قبضہ کرتی ہیں اس کو کہتی ہیں۔

"یہ مت خیال کرو کہ ہم تم پر قبضہ کرنے آئے ہیں بلکہ تہذیب سکھانے آئے ہیں"۔

جیسا یورپین حکومتوں کا یہ قول بے معنیٰ ہے۔ اسی طرح پولوس کا یہ قول بھی دلفریب ہے۔

اب سنیئے! ہم پولوس کے بڑے میاں کی شہادت سناتے ہیں جن کے کفارہ پر ایمان لاکر شریعت کو باطل کیا جاتا ہے۔ یعنی مسیح کیا فرماتے ہیں:

"جو کوئی ان (شرعی) حکموں میں سے سب سے چھوٹے کو ٹال دیوے اور ویسا ہی آدمیوں کو سکھاوے آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائیگا پر جو کہ عمل کرے اور سکھلاوے وہی آسمان کی بادشاہت میں بڑا کہلائیگا"
(انجیل متی ۵ باب کی ۱۹)

ناظرین! دیکھئے جناب مسیح اعمال شریعت کی بابت کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ اور پادری صاحب باتباع پولوس کیا کہتے ہیں:

پادری صاحب سے ایک سوال پادری صاحب! آپ نے اپنی کتاب "میں کیوں مسیحی ہوا؟" کے صفحہ ۴۰ پر لکھا ہے کہ میں نے قرآن کی شہادت سے مسیح کو راستباز مانا ہے۔ اب تو سارا مدار پولوس کے قول پر ہے۔ کیا پولوس کو بھی قرآن کی شہادت سے راستباز اور راست گو مانا ہے؟ ذرہ وہ آیت بھی لکھ دیجیے۔ ہمیں کچھ ضروری نہیں کہ ہم پولوس کی بابت وہ لکھیں جو دیگر مصنفوں نے لکھا ہے بلکہ ہم قرآنی شہادت سننے کے منتظر ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ پادری صاحب کے حق میں ہم نے یہ سمجھا کہ
"آپ مفت خوری کے لئے مسیحی ہوئے ہیں"
کیونکہ اسلام بلکہ کل ادیان میں نیک اعمال کرنے کی تاکید ہے اور مروجہ عیسائی دین میں ان کی ضرورت نہیں بلکہ بغیر نیک اعمال کے مسیح پر محض ایمان لانے سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ اس پر کسی اہل دل نے خوب کہا ہے ؎

جی عبادت سے چرانا اور جنت کی ہوس
کام چور اس کام پر کس منہ سے اجرت کی ہوس

نوٹ: اصل کتاب کا جواب ختم ہے۔ آگے اس کے دیباچہ کا جواب درج ہوتا ہے۔ جس میں پادری صاحب کی بمبئی کی زندگی پر روشنی پڑے گی۔

ہمارے مخاطب پادری سلطان محمد خان صاحب نے کتاب مذکور میں اپنی پیدائش اور ابتدائی زندگی کا جو حال لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوتے اور اگست ۱۹۰۳ء کو آپ مسیحی ہوئے۔ اس حساب سے بوقت مسیحی ہونے کے آپ کی عمر مکمل ۲۲ سال تھی۔ اسی عمر میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔ اور انجمن ضیاء الاسلام بمبئی میں قائم کی جس کے آپ خیریت سے صدر تھے۔ اور عبدالرؤف صاحب سکرٹری وغیرہ۔ (ص ۳-۱۸-۴۶)

آپ نے انجمن کے انعقاد کی تاریخ نہیں بتائی۔ ہاں ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انجمن ضیاء الاسلام ۱۸۹۵ء میں قائم ہوئی تھی جو آج تک بھی بفضلہٖ تعالیٰ جاری ہے۔ اس حساب سے انجمن کے انعقاد کے وقت آپ کی عمر ۱۴ سال کی ہوگی۔ کوئی دانا اس کو کیونکر تسلیم کر سکتا ہے کہ چودہ سال کا لڑکا وہ بھی غریب طالب علمی کی حالت میں اتنی بڑی انجمن کی بنا قائم کر سکے!۔

ہمارا خیال تھا کہ پادری صاحب نے اپنی پوزیشن بڑی بتانے کو ایسا لکھا ہے تاکہ مسلمانوں پر میرا اثر ہو، اور عیسائیوں میں قدر۔ چونکہ اس سے دونوں قوموں کو دھوکہ لگنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے ہم نے ضیاء الاسلام کے سکرٹری جناب مولوی عبدالرؤف خان صاحب کو خط لکھا کہ آپ پادری سلطان محمد صاحب کی بابت اصل حالات سے اطلاع دیجئے تاکہ پبلک کو اس سے آگاہ کیا جائے۔ مولوی صاحب موصوف کا مکرمت نامہ آیا جو درج ذیل ہے:

"محترم مولانا صاحب! السلام علیکم۔ پوسٹ کارڈ کے ذریعہ اطلاع دی ہے کہ اس ہفتہ سلطان محمد کے مختصر حالات لکھ کر روانہ کروں گا لہٰذا یہ مختصر حالات ہیں۔ کم و بیش کرنے کا آپ کو اختیار ہے جس

طرح مناسب ہو آپ شائع کریں۔ جس رسالہ میں شائع ہوں چند
کاپیاں مجھ کو روانہ فرمائیں۔ تاکہ یہاں مشنریوں میں تقسیم کرادوں۔
سلطان محمد عـــہ صاحب کے حالات اختصار سے حوالہ قلم کرتا ہوں کہ
انجمن ضیاء الاسلام ۱۸۹۵ء میں محض عیسائیوں اور آریوں سے تحریری
اور تقریری بحث ومباحثہ کرنے کو قائم ہوئی ہے۔ ایک سَو سے
زائد عیسائی۔ آریہ۔ پارسی وغیرہ کو اسلام میں داخل کیا ہے۔ ۱۹۰۲ء
میں سلطان محمد کے قدم بغرض تعلیم منارہ والی مسجد میں آئے اور مسجد کی
روٹیوں پر بسر اوقات کرنے لگا۔ چونکہ انجمن کے ہر ہفتہ جلسے ہوا
کرتے تھے جن میں علاوہ مناظرہ اور مباحثہ کے تعلیم اور پولیٹیکل مسائل
پر کبھی لیکچر وغیرہ ہوتے تھے۔ اس وقت مولانا ابو الکلام آزاد۔
مولانا ابو نصر آہ برادر مولانا ابو الکلام آزاد۔ آغا حشر کاشمیری۔ مولانا
سخا صاحب۔ مولانا سُہا صاحب۔ جناب ثاقب بدایونی۔
رونق لکھنوی۔ مرزا نظامی۔ منشی امیر الدین وغیرہ حضرات تقریریں
کیا کرتے تھے۔

جلسوں میں شرکت کی غرض سے پادری ڈیوڈ۔ پادری اسمتھ۔ پادری
فرنچ۔ پادری ٹیلر۔ پادری احمد شاہ جبلپوری۔ پادری جوزف
بہاری لال۔ مسٹر منصور مسیح اور دیگر کئی اور دیسی مشنری آتے تھے۔
آریوں میں سے پنڈت جگناتھ۔ مسٹر خوشی رام۔ پنڈت شرما کے
علاوہ کئی اور آریہ بھی آتے تھے۔ ممکن ہے کہ سلطان محمد کسی کونے
میں بیٹھ کر تقریریں سنتا ہو۔ لیکن کسی جلسہ میں نہ کوئی تقریر کی، نہ کسی
~~عیسائی اور آریہ سے مباحثہ مناظرہ کیا۔ نہ کوئی نتیجہ [illegible]~~

عـــہ پہلے اس کا نام سلطان احمد تھا۔ اب اس نے سلطان محمد رکھ لیا ۱۲ (عبد الرؤف خاں)

بلکہ ہزارہا آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ اس میں انھوں نے شرکت کی ہو ذکی ہو۔ نہ ایسی مشہور و معروف ہستی تھی جس پر نظر پڑتی۔ اگر کوئی خاص بات ہوتی تو مقامی اخبارات میں ذکر آتا۔ خاص کر انجمن کے ماہانہ پرچہ "البلاغ" میں ضرور ذکر آتا۔

اب بھی میں اُن کو چیلنج دیتا ہوں کہ کوئی تحریر ایسی پیش کریں کہ آپ بانیٔ انجمن کب ہوتے ؟ یا صدر انجمن کب ہوئے ؟ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ صدر اور نائب صدر تو کیا آپ ایک غیر معمولی ممبر بھی نہ تھے۔ لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۳ء میں جلسہ بند کر کے میں دورہ پر گیا تھا۔ جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ منارہ والی مسجد کا معمولی طالبعلم عیسائی ہو گیا۔ تحقیق کرنے سے ثابت ہوا کہ سلطان محمد منصور مسیح کا بیٹا بن کر بپتسمہ لے کر ہمیر پور پادری احمد شاہ کانپوری کے پاس چلا گیا۔ منارہ والی مسجد کے طلبا ء سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسجد کی روٹیوں کے لیے اکثر شکایت کیا کرتا تھا۔ کپڑے وغیرہ کی اس کو سخت تکلیف تھی بعض میمنوں نے بلحاظ ہمدردی روپے قرض دیئے تھے بعض لوگ روپیوں کا تقاضا کرتے تھے۔ جس کے سبب ہمیشہ پریشان رہتا تھا۔ منصور مسیح نہایت تجربہ کار اور چالاک مشنری تھا۔ اس نے اس کی ناداری اور غربت دیکھ کر ہمدردی کی۔ یہ اس کے مکان پر آنے جانے لگا اور اس نے اس کو ترغیب دی۔ یہ ناتجربہ کار اور شباب کا عالم۔ گرجا میں . . . . کی آمد و رفت کا منظر دیکھ کر از خود رفتہ ہوا، اور کسی خاص غرض سے عیسائی ہو کر یہاں سے چل دیا۔ ممکن ہے کہ اس کی آرزو بر آئی ہو۔

اس زمانہ میں "الحق" نامی عیسائیوں کا ایک پرچہ نکلتا تھا

اس میں غیروں کی مدد سے مضامین بایں طور لکھنے شروع کئے کہ میں بڑا حاذق حکیم ہوں، میں بڑا فاضل ہوں ۔ بڑا دولتمند ہوں وغیرہ وغیرہ کا ایک سلسلہ چند روز تک جاری رکھا اور اپنے خداوندان کے خوش کرنے کی تدبیر نکالی مجھ کو معلوم ہوا تو میں نے اس کا جواب لکھ کر اڈیٹر "الحق" کو روانہ کیا۔ اڈیٹر صاحب نے دیکھا کہ اس مضمون سے سلطان کی سلطانی خاک میں مل جائے گی تو اڈیٹر صاحب نے لکھا کہ ذاتیات کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ میں عیسائیوں کے ہتھکنڈوں سے واقف ہوں کہ نیے مرید کو مولوی قاضی، سید، حکیم، پنڈت وغیرہ وغیرہ لکھ کر اس کی شان بڑھاتے ہیں۔ لیکن جب اُس کی قلعی کھول کر تصویر کا دُوسرا رخ دکھایا جاتا ہے تو بغلیں جھانکتے ہیں۔ چنانچہ سلطان محمد کی بابت بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ ایک معمولی طالب علم کے مضمون کو اہمیت دے کر دوسرے اخبارات میں شائع کرایا جائے۔

تین چار سال بعد بڑے دنوں کی تعطیل میں وہ اپنے (مصنوعی) باپ منصور مسیح کو ملنے آیا۔ جن کا قرض تھا ادا کیا۔ بعدہٗ واپس کانپور چلا گیا۔ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ سلطان محمدؐ مرتد سے مسلمان بن گیا۔ توحید کی تائید اور رد تثلیث میں ایک رسالہ لکھا جس کی ایک نقل ہمراہ خط کے روانہ کی اور خواہش ظاہر کی کہ میں بمبئی آؤں ۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ مسلمانوں کے خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے لہٰذا میں نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد سنا کہ سلطان محمدؐ پھر مرتد ہو گیا ۔ چونکہ جو آزادی عیسائیت میں ہے وہ اسلام میں کہاں۔ اس لئے دوبارہ مرتد ہو کر پادری صاحبان کو خوش کرنے کے لئے کوئی دوسرا رسالہ لکھا ہو گا

جس کا آپ نے ذکر فرمایا مجھ کو اس کا حال بپا دریوں کی معرفت معلوم تھا۔ مگر میں نے زیادہ جستجو نہ کی۔ خدا کا شکر ہے کہ شیر پنجاب نے اس کی طرف توجہ کی اور دندان شکن جواب دینے کے لئے قلم اٹھایا خدا آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

غالباً بمبئی کے حالات لکھنے کی اس نے اس لئے جرأت کی ہوگی کہ زمانہ گذر گیا۔ انجمن ضیاء الاسلام والے مر مرا گئے ہوں گے جو چاہوں لکھ کر پادریوں کو خوش کر دوں۔ یہ اس کو خبر نہ ہوگی، کہ بفضلہ تعالےٰ میں زندہ ہوں اور پادری جوزف بہاری لال اگرچہ مشن سے علیحدہ ہیں، تاہم وہ ابھی تک عیسائی ہیں۔ سلطان محمدؐ کی طرح زر کے طالب نہیں ہیں۔ میرے بیان کی تصدیق کریں گے۔ کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے درست ہے۔

مجھ کو تعجب تو یہ ہوا کہ سلطان محمدؐ مسیحی ہو کر سفید جھوٹ لکھنے پر کیوں دلیر ہوا۔ جھوٹے پر خدا کی لعنت! آمین۔

(عبدالرؤف خان از بمبئی)

مسلمان ہم نہ چاہتے تھے کہ اپنے بچھڑے ہوئے بھائی کی شیخی کا جواب شایع کرتے لیکن کیا کریں ایسا نہ کرنے سے اُن کی کتاب کا جواب نامکمل رہ جاتا۔ خطرہ تھا کہ اس عدم تکمیل کا اُن کو گلہ ہوتا، اور ناظرین کو ٹھوکر کا باعث۔ اس لئے مراسلہ مذکورہ درج کیا گیا۔ خدا سے دعا ہے، کہ ہمارے بچھڑے ہوئے مسلم بھائی کو ہم سے ملا دے۔ آمین۔ اللہ بس باقی ہوس!

پادری سلطان محمدؐ خاں صاحب! ۵

جنگ کردی آشتی کن زانکہ نزد عاقلاں ۔۔۔ ایں مثل مشہور اوّل جنگ آخر آشتی

عیسائی مذہب کا بنیادی پتھر اور راہ نجات

عیسائیوں میں ایک بزرگ گذرے ہیں جن کو "مقدس اتھاناسیس" کہتے ہیں۔ اُن کا مصنفہ ایک عقیدہ ہے جو گرجوں میں ہر عید اور ہر تقریب پر امام پڑھ کر حاضرین کو سناتا ہے اس سے عیسائی مذہب کی پوری حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے:

"جو کوئی نجات چاہتا ہو اس کو سب باتوں سے پہلے ضرور ہے کہ عقیدۂ جامعہ رکھے۔ اس عقیدے کو جو کامل اور بے داغ نگاہ نہ رکھے، وہ بے شک عذاب ابدی میں پڑے گا۔ اور عقیدہ جامعہ یہ ہے کہ ہم تثلیث میں واحد خدا کی اور توحید میں تثلیث کی پرستش کریں نہ اقانیم کو ملائیں نہ ماہیت کو تقسیم کریں۔ کیونکہ باپ ایک اقنوم، بیٹا ایک اقنوم، اور روح القدس ایک اقنوم ہے۔ مگر باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا۔ اور ویسا ہی روح القدس ہے۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح القدس غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود اور روح القدس غیر محدود۔ باپ ازلی، بیٹا ازلی، اور روح القدس ازلی۔ تاہم تین ازلی نہیں، بلکہ ایک ازلی۔ اسی طرح تین غیر محدود نہیں اور نہ تین غیر مخلوق، بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود۔ یونہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق اور روح القدس قادر مطلق، تو بھی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق ہے۔ ویسا ہی باپ خدا بیٹا خدا اور روح القدس خدا۔ تس پر بھی تین خدا نہیں، بلکہ ایک خدا۔ اسی طرح باپ خداوند

بیٹا خداوند اور روح القدس خداوند۔ تو بھی تین خداوند نہیں،
بلکہ ایک خداوند۔ کیونکہ جس طرح مسیحی عقیدے سے ہم پر فرض
ہے کہ ہر ایک اقنوم کو جداگانہ خدا اور خداوند مانیں۔ اسی طرح
دین جامع سے ہمیں یہ کہنا منع ہے کہ تین خدا یا تین خداوند ہیں۔
باپ کسی سے مصنوع نہیں، نہ مخلوق نہ مولود۔ بیٹا اکیلے باپ سے
ہے مصنوع نہیں نہ مخلوق پر مولود ہے۔ روح القدس باپ اور
بیٹے سے ہے نہ مصنوع نہ مخلوق نہ مولود پر نکلتا ہے۔ پس ایک باپ
ہے، نہ تین باپ ایک بیٹا ہے نہ تین بیٹے، ایک روح القدس ہے
نہ تین روح القدس۔ اور اس تثلیث میں ایک دوسرے سے پہلے
یا پیچھے نہیں، ایک دوسرے سے بڑا یا چھوٹا نہیں، بلکہ بالکل
تینوں اقانیم باہم ازل سے برابر یکساں ہیں۔

اس لئے سب باتوں میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا تثلیث میں توحید
کی اور توحید میں تثلیث کی پرستش کرنی چاہئے پس جو کوئی نجات
چاہتا ہے اسے ضرور ہے کہ تثلیث کی بابت ایسا ہی سمجھے۔ علاوہ
اس کے نجات ابدی کے لئے ضرور ہے کہ ہمارے خداوند یسوع مسیح
کے مجسم ہونے پر بھی ایمان صحیح رکھے۔ کیونکہ ایمان صحیح یہ ہے کہ ہم
اعتقاد اور اقرار کریں کہ خدا کا بیٹا ہمارا خداوند یسوع مسیح خدا اور
انسان بھی ہے۔ خدا ہے باپ کی ماہیت سے عالموں کے پیشتر
مولود اور انسان ہے۔ اپنی ماں کی ماہیت سے عالم میں پیدا ہوا۔
کامل خدا اور کامل انسان نفس ناطقہ اور انسانی جسم کے ساتھ۔
الوہیت کی راہ سے باپ کی برابر۔ اور انسانیت کی راہ سے باپ
سے کمتر۔ وہ اگرچہ خدا اور آدمی بھی ہے پر دو نہیں بلکہ ایک مسیح
ہے۔ ایک ہی اس طور پر نہیں کہ الوہیت کو جسم سے بدل ڈالا بلکہ

انسانیت کو خدا میں بیدسب طرح سے ایک ہی ماہیت کے ملانے سے نہیں بلکہ اقنوم کی بلبتائی سے ۔ کیونکہ جس طرح نفس ناطقہ اور جسم ایک انسان ہے اسی طرح خدا اور انسان ایک مسیح ہے ۔ جس نے ہماری نجات کے واسطے دکھ اٹھایا ۔ عالم ارواح میں جا اترا ۔ تیسرے دن مُردوں میں سے جی اُٹھا بائبل دعا عمیم صہ ۲۴)

مسلمان ناظرین کرام ! یہ ہے عیسائی مذہب کا اصل الاصول جس کی بابت ہم کچھ نہیں کہتے ؎

نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

سلسلہ ندوۃ المحدثین

(۷)

نام کتاب ــ ــ ــ ــ ــ جوابات نصاریٰ

نام مصنف ــ ــ ــ ــ ــ ــ ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ

صفحات ــ ــ ــ ــ ــ ۹۶

تعداد ــ ــ ــ ــ ــ ــ ایک ہزار

طبع اوّل ــ ــ امرتسر ــ ــ ــ ۱۹۳۰ء

طبع دوم ــ ــ ــ ملتان ــ ــ ــ ۱۹۸۰ء

طبع سوم ــ ــ ــ ندوۃ المحدثین گوجرانوالہ ــ ــ ۱۹۸۳ء

تقسیم بلا قیمت

باھتمام

ضیاء اللہ کھوکھر ۱۳۔ اسلام آباد، گوجرانوالہ (پاکستان)